نئے زمیں نئے آسماں

علی حیدر ملک

اِنتظار حسین

"میں نے یہ دیکھا اور یہ جانا کہ ہر زمین ظالم ہے"

"جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی؟"

"ہاں جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی اور جو زمین دارالامان بنتی ہے وہ بھی — میں نے گیا نام کے نگر میں جنم لیا اور گیا کے اس بھکشو نے یہ جانا کہ دنیا میں دُکھ ہی دُکھ ہے اور نروان کسی صورت نہیں ہے اور ہر زمین ظالم ہے۔"

"اور آسمان؟"

"آسمان تلے ہر چیز باطل ہے"

("شہرِ افسوس" سے)
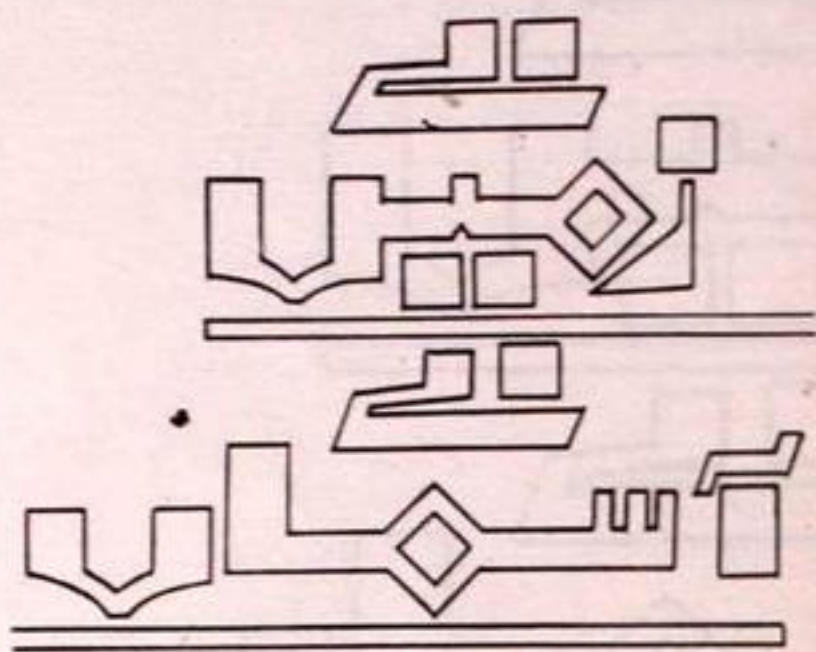
علی حیدر ملک
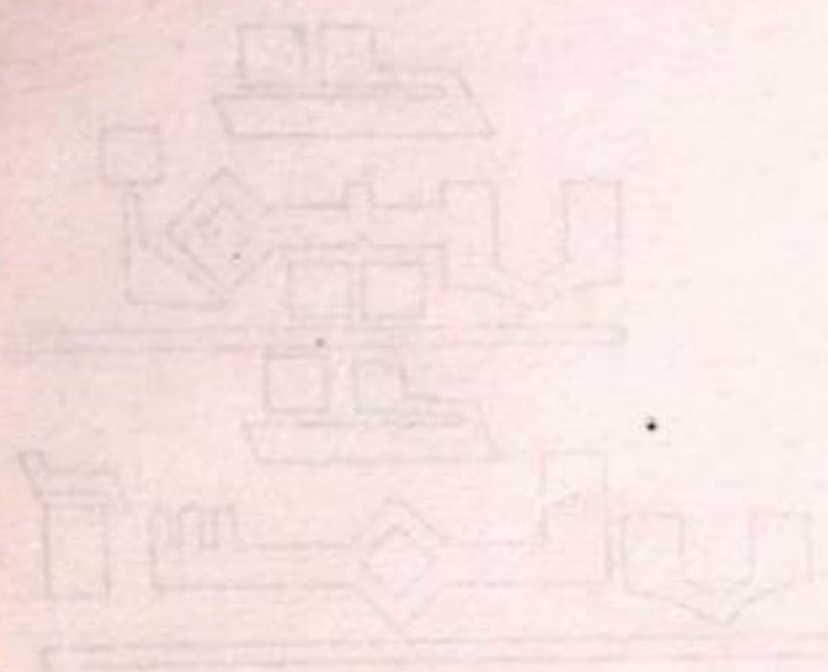
افسانے

۱۹۶۷ء تا ۱۹۸۴ء
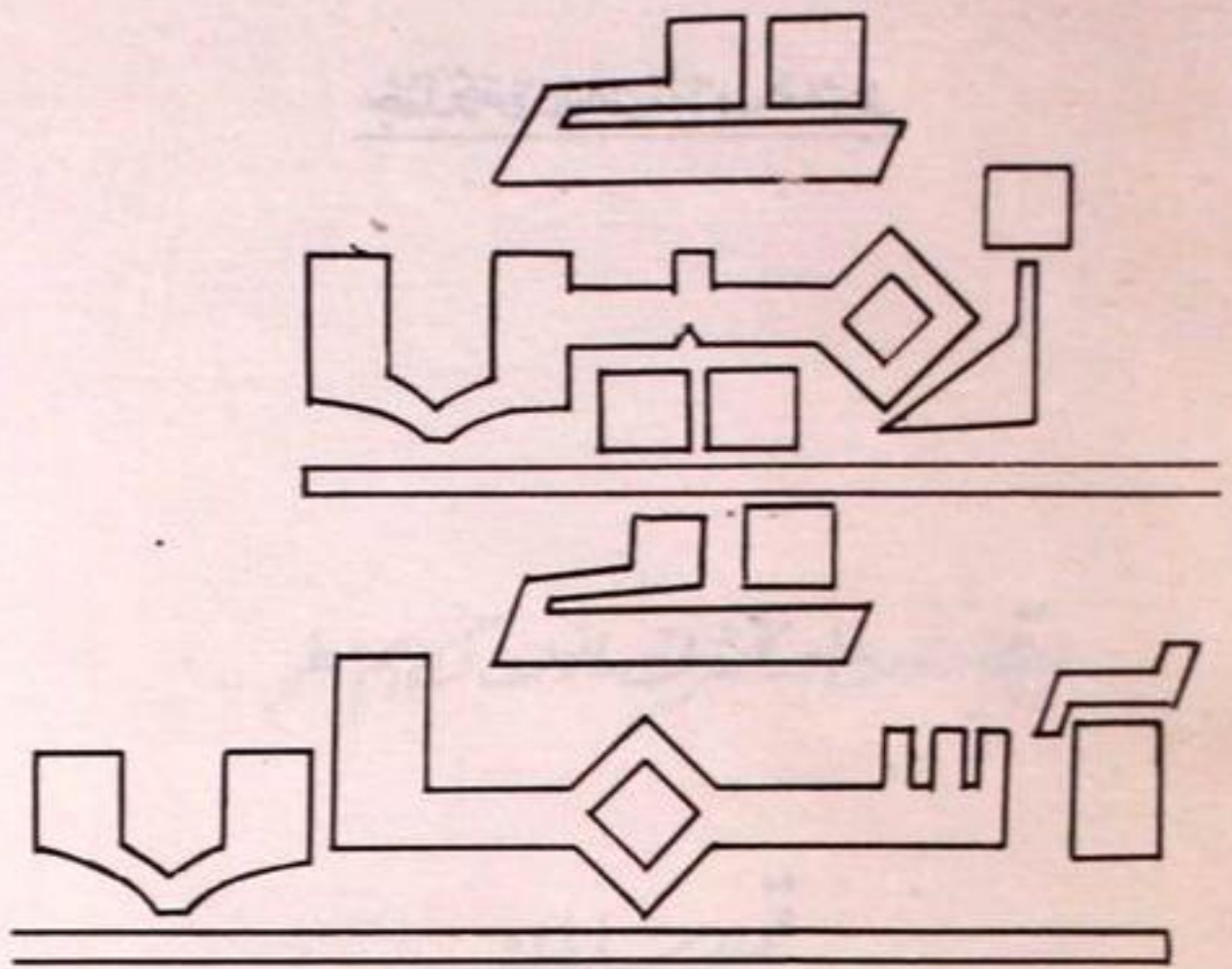
علی حیدر ملک

منظر پبلیکیشنز

اے ۳۶۰- واجد اسکوائر بلاک ۱۶

گلشنِ اقبال، کراچی ۴۷

کتاب : بے زمیں بے آسماں (افسانے)

مصنّف : علی حیدر ملک

طبع اوّل : فروری ۱۹۸۶ء (جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ)

سرورق : بشیر موجد

تصویر : اعجاز ہاشمی

کتابت : مظہر عقیل

طابع : ایجوکیشنل پریس کراچی

ناشر : منظر پبلی کیشنز۔ کراچی

تعداد : گیارہ سو

قیمت : پچیس ۲۵ روپے
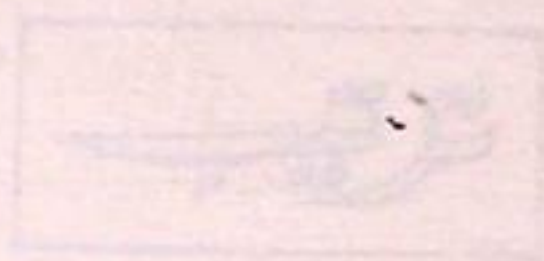
تپتے دنوں اور ٹھٹھرتی راتوں کی ہم سفر

قیصر سلطانہ

کے نام

کہانیوں سے پہلے

اپنے جگر لخت لخت کو یکجا کرنا اور پھر انھیں ترتیب دے کر کتابی صورت میں پیش کرنا ایک مشکل کام ہے۔ خصوصاً مجھ جیسے آدمی کے لیے جس کی زندگی ایک ایسی تنی ہوئی رسّی پر چلنے میں گزری ہے جس کے چاروں طرف آگ کے شعلے دہک رہے تھے۔ میرے لیے تو یہی سوال ہمیشہ سوہانِ روح بنا رہا ہے کہ میں لکھتا کیوں ہوں؟

کہانیاں لکھنا میرے لیے کوئی خوشگوار فعل نہیں ایک اذیت ناک عمل ہے اسی لیے میں حتی الامکان اس سے گریز کی کوشش کرتا ہوں۔ اور صرف اسی وقت قلم اٹھاتا ہوں جب فرار کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ گویا کہانیاں لکھنا میرا شوق نہیں بلکہ مجبوری ہے۔ مجبوری یہ کہ میں ایک فرد کی حیثیت سے جو کچھ دیکھتا، سوچتا اور محسوس کرتا ہوں اس کا اظہار بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔ دیکھنے، سوچنے اور محسوس کرنے کا عمل آدمی کو ہمیشہ ایک آشوب میں مبتلا رکھتا ہے۔ اس آشوب سے دوچار ہو کر جہاں خاموش رہنا دشوار ہوتا ہے، وہاں دوسری طرف اظہار بھی آسان نہیں ہوتا۔ غرض لکھنے والے کی جان مجنوں کی طرح

وصال و فراق کے دوگونہ عذاب میں مبتلا رہتی ہے۔ اس میں کھونا تو بہت کچھ پڑتا ہے مگر حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ہمارے معاشرتی ڈھانچے میں زر اور زرداری کو ضرورت سے زیادہ اہمیت حاصل ہے جبکہ لکھنے والے کو اس کی تخلیق سے کوئی مالی فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ ستم ظریفی یہ ہے کہ خونِ جگر صرف کرنے کے بعد کتاب چھپوانے کے لیے گرہ سے پیسے بھی خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ جہاں تک عزّت و وقار کا تعلق ہے تو اس کا تصوّر بھی یا تو زر سے وابستہ ہے یا اقتدار سے، تخلیقی سرگرمی سے نہیں۔ رہ گئی شہرت یا ناموری تو صنعتِ شہرت سازی اور ہوسِ شہرت کے اس عہد میں یہ بات شائد مشکل ہی سے قابلِ یقین سمجھی جائے گی کہ میں نے اپنے لیے کبھی شہرت یا ناموری کی تمنّا نہیں کی۔ میں تو جوگیوں اور صوفیوں کی مانند گوشہ نشینی کی خاموش اور گمنام زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن وائے ناکامی کہ بہت سی اور آرزوؤں کی طرح میری یہ آرزو بھی پوری نہیں ہوئی۔ شہرت تو خیر کیا ملتی، مگر رسوائیوں نے بعض حلقوں میں نام کو متعارف ضرور کرا دیا۔ حصولِ شہرت کو اگر ادب کا مقصد تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی ادب سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا اس لیے کہ شہرت حاصل کرنے کے بہت سے دوسرے ذرائع و وسائل دریافت ہو چکے ہیں سا دب کی دنیا تو بہت محدود اور مختصر ہے۔ قصّہ کوتاہ یہ کہ میں کہانیاں لکھنے جیسے کارِ فضول کا گناہ گار ہوں۔ اور گزشتہ بیس برسوں میں میں نے درجنوں کہانیاں لکھی ہیں۔ یہ کہانیاں اردو کے معروف و معتبر رسائل میں شائع بھی ہوتی رہیں لیکن یہ تمام کہانیاں میرے پاس محفوظ نہیں ہیں۔ تلاشِ بسیار کے بعد جو کہانیاں دستیاب ہو سکیں ان کا انتخاب زیرِ نظر مجموعے میں شامل ہے۔ انتخاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی خاص دور یا رجحان کی کہانیوں کی بجائے ہر نوع اور ہر رجحان کی کہانیوں کو نمائندگی دی جائے تاکہ ان نقوشِ پا کے ذریعے میرے بیس سالہ سفر کا اندازہ ہو سکے۔

یہ مجموعہ کسی نقاد یا افسانہ نگار کے دیباچے یا تقریظ کے بغیر شائع کیا جا رہا ہے اس لیے کہ میرے نزدیک تحریر اپنا تعارف آپ ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ آج کل دیباچوں اور تقریظوں نے اپنی رہی سہی اہمیت بھی کھو دی ہے۔ سو بہتر یہی معلوم ہوا کہ اس طرح کی کسی رائے کے بغیر ہی

مجموعہ پیش کر دیا جائے۔ اگر اس میں شامل کہانیوں میں کوئی بات ہوگی تو وہ دیر یا سویر بہر حال تسلیم کر لی جائے گی اور اگر ان میں کوئی بات نہیں ہوگی تو بڑے سے بڑے نقاد کی تعریف و توصیف بھی انھیں زندگی نہیں عطا کر سکے گی۔

میرا ایمان ہے کہ ادیب کا اعمال نامہ انفرادی ہوتا ہے اور ادب کے میدان حشر میں صرف اعمال ہی کام آتے ہیں کوئی سفارش کارگر نہیں ہوتی۔ لہذا "بے زمیں بے آسماں" پیش ہے۔ بغیر کسی انکسار یا افتخار کے۔

علی حیدر ملک

کراچی۔ ۱۷ جنوری ۱۹۸۶ء

۲۷۔ نور پلازا۔ بلاک۔ ایم
شمالی ناظم آباد۔ کراچی ۳۳

بڑھتے فاصلوں کے درمیان

چلتے چلتے ایڑیاں دُکھنے لگی ہیں۔ ماں کہتی تھی جب ایڑیاں دُکھنے لگیں تو سمجھو کہ سفر ختم ہوا۔ لیکن یہ تو پُرانا قصہ ہے۔ ماں کی بات بھی پُرانا قصہ ہوگئی، کیسی ہنسی کی بات ہے۔ ہنستے ہنستے مجھے رونا آجاتا ہے۔

رونا تو مجھے اُس وقت بھی آیا تھا جب میں پہلی بار سفر پر روانہ ہوا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" — میرے باپ نے اپنی بھاری بلغمی آواز میں پوچھا تھا۔

"سفر پر۔" بھائیں بھائیں کرتے گھر پر نظر دوڑاتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

"کیا تم نے یقین کر لیا ہے کہ یہ سفر ضروری ہے؟"

"ہاں! ضرورت نے مجھے یقین پر مجبور کر دیا ہے۔"

میرا باپ اپنی اُنا کی چوٹی پر چڑھ کر خاموش ہو گیا۔

ماں میرے سر پر اپنے آنچل کا سایہ کئے کھڑی رہی۔ اُس نے نہ تو مجھے جانے کو کہا نہ رُکنے کو — مگر اُس کی ممتا کا آبِ حیات میرے وجود پر پھوار کی مانند برستا رہا۔

"ماں مجھے اجازت دو۔" میں نے اِلتجا کی۔

اور اُس نے آگے بڑھ کر اپنے لرزتے ہاتھوں سے میرے بازو پر امام ضامن باندھ دیا۔

"پاک پروردگار قدم قدم پر تیری حفاظت کرے۔" اُس کے ہونٹوں نے کہا یا نہیں لیکن میرے کانوں نے سُنا۔ میرے دِل نے بھی۔ میرے دماغ نے بھی — میرے روئیں

روئیں نے۔

سفر کی سمتیں تو شائد چار ہی ہیں لیکن جب میں نے پہلا قدم اُٹھایا تو محسوس ہوا کہ سمتیں صرف چار نہیں چار سو ہیں یا چار ہزار ہیں یا چار لاکھ ہیں — اور ہر سمت سے آواز آ رہی ہے — اِدھر آؤ۔ اِدھر آؤ — اِدھر۔

معلوم نہیں وہ کون سی سمت تھی جدھر مَیں نے پہلے پہل قدم بڑھائے تھے اور بڑھاتا رہا تھا — کبھی آہستہ کبھی تیز۔ کبھی تیز کبھی آہستہ۔ یوں ایک سفر میرے اندر جاری تھا اور ایک سفر میرے باہر۔

چلتے چلتے پاؤں تو نہیں تھکے لیکن ایسا محسوس ہوا کہ جسم سے توانائی کا ذخیرہ ختم ہونے لگا ہے — چال سست پڑنے لگی ہے آنتیں ایندھن کی کمی کے باعث جلنے لگیں۔

ماں کہتی تھی۔ "سفر پر روانہ ہونے سے پہلے زادِ راہ کا انتظام ضرور کر لینا چاہیئے۔"

مگر میں نے زادِ راہ کا انتظام نہیں کیا تھا سو......

سو میں نے اِردگرد نگاہ دوڑائی — اِردگرد صرف ایک ویرانہ تھا — اُجاڑ اور بے منظر۔

دُور بہت دُور گندم کے دانے کی مانند ایک بستی نظر آ رہی تھی۔ ہانپتا کانپتا، گرتا پڑتا میں اُس بستی تک پہنچا اور ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔

ایک آدمی نے دروازے سے باہر نکل کر پوچھا — "کیا ہے؟"

میری زبان میں نقاہت کے کانٹے چُبھے ہوئے تھے۔ مجھ سے کچھ بولا نہ گیا اور میں نے خاموشی سے اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا۔ ہاتھ پھیلاتے ہی ایسا لگا کہ میرا قد اچانک بالشت بھر کا رہ گیا ہے۔

وہ آدمی زیرِ لب مسکرایا اور اندر سے دُو روٹیاں لا کر میرے سامنے رکھ دیں۔

مَیں نے جلدی جلدی وہ روٹیاں چٹ کر لیں۔

"مسافر معلوم ہوتے ہو؟"

"ہاں!"

"مگر زادِ راہ تمھارے پاس نہیں" — اُس آدمی نے اپنے لہجے کے تمسخر کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے غلطی ہو گئی یا شائد میرے بزرگوں سے" — اب میری آنکھوں میں چمک آ گئی تھی اور مَیں بولنے کے قابل ہو گیا تھا۔

"زادِ راہ کی ضرورت تو تمہیں آئندہ بھی پڑے گی۔ کیوں؟"

"ہاں!"

"تو پھر خالی ہاتھ خالی پیٹ زمین ناپنے کی بجائے تم یہیں کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟"

"کام؟ کیسا کام؟" — الفاظ اچانک میری زبان سے پھسل گئے۔

وہ ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے مکان کے عقب میں لے گیا، اور ایک بہت بڑے گودام کے آہنی دروازے پر کھڑا ہو کر بولا — "یہ دیکھتے ہو۔ یہ گندم کی بوریاں ہیں۔ تمہیں یہ بوریاں اُٹھا اُٹھا کر یہاں سے بازار لے جانا ہوں گی۔ بازار کچھ زیادہ دُور نہیں، کوئی ڈیڑھ کوس ہو گا۔ ہر بوری سے ایک مٹھی گندم بازار پہنچتے ہی تمہیں مل جائے گا۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کتنی بوریاں روز بازار پہنچاتے ہو۔"

مَیں راضی ہو گیا، اور سُورج اُگنے سے ڈوبنے تک بوریاں ڈھونے لگا۔

سُورج ڈوبنے کے بعد مزدوری کے گندم لیکر میں اپنی جھونپڑی میں آتا اور رات گئے

تک انھیں چکی میں پیستا رہتا۔

جب گندم کا آٹا کنستروں میں محفوظ ہو گیا تو ایک دن گودام اور بازار کے درمیان میں نے محسوس کیا کہ میری چال سست پڑنے لگی ہے۔ اُس دن میں نے معمول سے کم پھیرے لگائے — پھر اکثر ایسا ہونے لگا۔

مجھے محسوس ہوتا کہ پورا بدن ٹوٹ رہا ہے اور رگوں میں دَورانِ خون سے بھی زیادہ تیزی سے چیونٹیاں دوڑ رہی ہیں۔ طبیعت بہت اُچاٹ ہو گئی تو ایک دن میں گودام جانے کی بجائے بستی سے باہر نکل گیا اور چلتا رہا — چلتا رہا.....۔

"دو گھونٹ پانی پلا دو" — کنویں سے پانی بھرتی ہوئی عورت کے سامنے ہاتھوں کی اوک بناتے ہوئے مَیں نے درخواست کی۔

پانی پی کر جب میں نے آستین سے اپنا منہ پونچھ لیا تو اُس عورت نے کھنکتی آواز میں پوچھا۔ "پیاس بجھ گئی؟"

میں نے کوئی جواب دینے کی بجائے صرف ممنونیت کی نظر سے اُسے دیکھا۔

"صرف دو چلّو پانی سے پیاس بجھ گئی — بس" عورت کھِل کھِلا کر ہنسی۔

میرے پورے وجود میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔

شام کا جھٹپٹا ہو رہا تھا۔ پرندے جوڑوں کی شکل میں تیرتے اپنے اپنے ٹھکانوں کو جا رہے تھے۔

عورت نے گاگر اُٹھا کر کمر پہ رکھی اور زلفوں کو پیچھے جھٹک کر چلنے لگی۔ وہ چلی تو جیسے زمین بھی اُس کے ساتھ چلنے لگی۔ آسمان بھی اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ ساری کائنات اس کے ساتھ چلنے لگی۔

میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

لذت کے نشے میں شرابور کئی دن کئی راتیں میں نے اُس عورت کے ساتھ گزاریں۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ رگوں میں چیونٹیوں کی دوڑ تو بند ہو گئی ہے مگر سائیں سائیں کرتے ایک بے رنگ، بے نام خلا نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ہے — اور ہر آن کوئی چیز میرے احساس کے بدن میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے۔ دُکھ کی ایک کالی رات میں میں نے اُس عورت کو سوتا چھوڑا اور اس کی کشش کے دائرے سے باہر آگیا۔ پو پھٹے جب کہ چڑیاں چہچہاتی ہوئی اپنے آشیانوں سے نکل رہی تھیں، میں ایک پہاڑی کے پاس پہنچا۔ پہاڑی کے دامن میں ایک گھنے درخت کے نیچے جس کی بے شمار جڑوں میں یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ اصل جڑ کون سی ہے، میں آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ تب دُنیا کی ہر چیز نے مجھ سے پردہ کر لیا۔ صرف روشنی کا ایک ہالہ تھا جو مجھے اپنی آغوش میں لئے تھا۔ میرے اندر سائیں سائیں کرتا بے رنگ بے نام خلا بھی دُودھیا روشنی سے بھر گیا۔ پھر نہ جانے کتنے سُورج کتنے سورج میرے گرد چکر کاٹ کر گزر گئے — آنکھ کُھلی تو معلوم ہوا کہ دُنیا ابھی ابھی تخلیق ہوئی ہے یا میں نے ہی ابھی ابھی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

ہاتھ پاؤں جھاڑ کر چلنے لگا تو پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ سانسیں چلنے لگیں۔

جیسے تیسے گرتا پڑتا پھر اسی گودام پر پہنچا اور گودام سے بازار، بازار سے گودام کے درمیان گردش کرنے لگا۔

بدن پھر ٹوٹنے لگا۔ رگوں میں چیونٹیاں دورانِ خون سے بھی زیادہ تیزی سے دوڑنے لگیں — پھر وہی کنوئیں سے پانی بھرنے والی عورت اور لذّت کے نشے میں شرابور دن اور

رات ـــ

پھر وہی سائیں سائیں کرتے بے رنگ بے نام خلاء کی اذیّت ناک گرفت اور پہاڑی کے دامن میں گھنے درخت کے نیچے روشنی کا ہالہ ـــ مگر پھر وہی جلتی آنتیں اور گندم کا گودام....

گودام، کنویں اور درخت کے درمیان میں مستقل سفر میں ہوں لیکن ان کے درمیان کا فاصلہ کسی طرح کم نہیں ہوتا بلکہ روز بروز ایسا لگتا ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

چلتے چلتے پاؤں کی ایڑیاں دُکھنے لگی ہیں۔ ماں کہتی تھی ایڑیاں دُکھنے لگیں تو سمجھو کہ سفر ختم ہوا ـــ

مگر؟

جھوٹے سچّے خواب

بولتے بولتے وہ چُپ ہو جاتا ہے۔ چُپ رہتے رہتے رونے لگتا ہے۔ روتے روتے پھر بولنے لگتا ہے۔

"ہوائیں ساکت ہیں۔ درختوں کی جڑیں خشک ہو چکی ہیں۔ پودوں میں پھُول نہیں اُگتے۔ دریاؤں کا پانی ٹھہر گیا ہے۔ سُورج کی حرارت اور چاند تاروں کی روشنی مدھم پڑتی جا رہی ہے....."

"کیا تم جاگ رہے ہو؟" — میں اُس سے سوال کرتا ہوں۔

"ہاں! میں جاگ رہا ہوں۔" وہ اپنی اسی روئی روئی آواز میں جواب دیتا ہے۔

"اور آنکھیں کھُلی ہیں؟"

"میری دونوں آنکھیں بھی کھُلی ہیں۔"

"صرف چہرے پر بجی دو آنکھیں نہیں، تمام حواس کی آنکھیں کھول کر دیکھو کہ کیا تم سانس نہیں لے رہے؟ درختوں کی کچنار شاخیں جھُوم نہیں رہیں؟ پودوں کے سرے پر بھونرے اور تتلیاں منڈلا نہیں رہیں؟ دریاؤں کا پانی اٹکھیلیاں کرتا قدم قدم آگے نہیں بڑھ رہا؟ سُورج کی حرارت سے پاؤں کے نیچے کی ریت تپ نہیں رہی؟ — اور کیا چاند تاروں کی روشنی دلوں میں ہُوک نہیں پیدا کرتی؟"

اُسے چُپ سی لگ جاتی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہے پھر آہستہ آہستہ سسکیاں لینے لگتا ہے — پھر سسکیوں بھری آواز ہی میں کہتا ہے —

"مجھ میں اور تم میں کیا فرق ہے؟ میرے بھی دو کان ہیں دو آنکھیں ہیں ایک ناک ہے.... اور تمہارے بھی۔ پھر بھی مجھے جو کچھ نظر آتا ہے وہ تمہیں نظر نہیں آتا ــــ یا تم جو کچھ دیکھتے ہو وہ میں نہیں دیکھ پاتا ــــ آخر ایسا کیوں ہے؟"

"کچھ لوگ صرف وہی دیکھ سکتے ہیں جو کہ ان کی نظروں کے سامنے موجود ہو۔ کچھ وہ بھی نہیں دیکھ سکتے ــــ اور کچھ حقیقت کی بجائے خواب دیکھتے ہیں۔"

"حقیقت کی بجائے خواب؟"

"ہاں! یعنی وہ جو موجود نہیں ہے مگر لوگوں کو نظر آتا ہے۔"

"کیسے؟"

"خواب میں۔"

"خواب یعنی نیند؟"

"نیند نہیں ــ وہ جو نیند میں آنکھیں بند ہونے کے باوجود دکھائی دیتا ہے۔"

"گویا نیند میں آنکھیں بند ہونے کے باوجود نظر آتا ہے؟" ــــ وہ سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ موٹی موٹی، پتلی پتلی بہت ساری لکیریں اُس کی چوڑی پیشانی کو ہر طرف سے گھیرے میں لے لیتی ہیں ــــ "لیکن مجھے تو اس طرح کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

"گویا تم خواب نہیں دیکھتے؟"

"نہیں۔ میرے حواس نے آج تک ایسا کوئی منظر نہیں دیکھا۔"

"حیرت ہے!"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تم آج جو کچھ دیکھتے ہو کل اسی کو خواب کہہ کر بیان کر دیتے ہو؟"

"نہیں نہیں۔ خواب تو بس خواب ہوتا ہے۔ مَیں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟"

میری آنکھیں یا شاید میرے حواس یا شاید میرا وجود تو ہر رات کوئی نہ کوئی خواب دیکھتا ہے۔ کبھی معلوم ہوتا ہے کہ مَیں اُڑن کھٹولے پر اُڑا جا رہا ہوں۔ کبھی ایسا لگتا ہے کہ دلدل میں دھنس

رہا ہوں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ ــــ دُنیا میں ہر آدمی خواب دیکھتا ہے لیکن وہ .... ؟

اُسے میں کیسے بتاؤں کہ خواب کیسے دیکھے جاتے ہیں۔

ہر شے دکھائی جا سکتی ہے مگر خواب تو ہر آدمی صرف خود دیکھتا ہے۔ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہوتا۔ خواب تو ایک خود کار عمل ہے۔ آدمی خود بھی چاہے تو اپنی خواہش اور مرضی سے نہیں دیکھ سکتا۔

خواب ہمارا انتخاب کرتے ہیں۔

ہم خوابوں کا انتخاب نہیں کر سکتے۔

کیسی عجیب مجبوری ہے؟

"یار! میری بیوی مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ میرے بچے مجھے غیر سمجھتے ہیں۔ ہر آدمی مجھے شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے"..... وہ اپنی بلکتی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔

"عجیب بیماری ہے!"

"نہیں یار! میں ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ مجھے کوئی بیماری نہیں۔"

"ڈاکٹر کو کیا معلوم کہ تمہیں کیا بیماری ہے!"

"کیا بیماری ہے؟"

"یہی کہ تم خواب نہیں دیکھتے۔"

"آخر میں خواب کیسے دیکھوں؟" ــــ وہ بڑی بے چارگی سے سوال کرتا ہے پھر خاموشی کے سمندر میں غوطہ لگا دیتا ہے۔

میں بھی اپنی آواز کو خود ہی قید کر لیتا ہوں۔

ایک دن وہ آتا ہے تو تازگی اور بشاشت اس کے چہرے پر دھنک کی مانند کھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

"یار! میں نے کل رات ایک خواب دیکھا...."

"واقعی؟ تم نے خواب دیکھا؟" ــــ حیرت اور مسرت سے میری آواز بھرا جاتی ہے۔

"ہاں!"

"کیا دیکھا؟"

"میں نے دیکھا کہ سبزے سے بھرا ایک میدان ہے جس کے چاروں اطراف رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ میدان کے اندر بے شمار مرد، عورتیں اور بچے اِدھر سے اُدھر چہل قدمی کر رہے ہیں۔ سبھوں کے چہرے پر محبت اور طمانیت کا گلال برس رہا ہے۔ جب میں اس سر سبز میدان میں داخل ہوا تو کئی آدمی یا اخی یا اخی کہتے ہوئے میری طرف دوڑے۔

میں نے پوچھا ۔ "بھائی! یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یا اخی! یہ وہ سر زمین ہے جس کا خواب ہمارے بزرگوں نے دیکھا تھا" ۔ ایک آدمی نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے کہا ۔ "تم بھی آؤ۔ یہاں کے رسیلے پھل کھاؤ۔ شیریں چشمے کا پانی پیو۔ یہ سر زمین ہم سب کی مشترکہ میراث ہے" ۔

وہ خواب سُناتے سناتے اچانک رُکا پھر بولا ۔ "میں تم سے بیان نہیں کر سکتا کہ وہ سر زمین کتنی حسین اور وہاں کے لوگ کتنے پیارے تھے" ۔ وہ کچھ دیر کو رُکا، رُکا رہا پھر خوابناک لہجے میں بولا ۔ "یار! خواب بھی کتنی بڑی نعمت ہیں"۔

"ہوں!" ۔ میں نے آہستہ سے کہا اور خاموشی کے ساتھ اُس کے چہرے پر کھلے ہوئے تازہ شگوفوں کی بہار دیکھتا رہا۔

"یار! میں نے رات پھر ایک خواب دیکھا" ۔ اُس نے کئی روز کے بعد آکر مجھے بتایا۔

"اچھا ۔ کیا؟"

"میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا چٹیل سا میدان ہے جس میں بہت سارے لوگ جمع ہیں۔ ان لوگوں کے رنگ سیاہی مائل ہیں اور قد چھوٹے چھوٹے۔ وہ کچھ بولتے نہیں۔ بس گھور گھور کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ میرے میدان میں داخل ہونے پر سبھوں نے مجھے اچنبھے کی نظر سے دیکھا۔ میں نے ان میں سے ایک کو بازو سے پکڑ کر سوال کیا۔

"بھائی! یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یہ وہ سرزمین ہے جس کا خواب ہمارے بزرگوں نے دیکھا تھا"۔ اُس آدمی نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کیا تمہارے بزرگ بھی بونے تھے؟"

"نہیں۔ کہتے ہیں کہ اُن کا قد بہت اُونچا تھا مگر.... " اُس نے ذرا رُک کر اِدھر اُدھر دیکھا پھر اپنی آواز کی لو دھیمی کرلی ـــ" مگر ہمارا قد بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے اور سر جھکاتے جھکاتے بس اتنا رہ گیا ہے"۔

"تم لوگوں کو کس چیز کا بوجھ اُٹھانا اور کس کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے؟"

"خاموش خاموش۔ دیکھو وہ آرہا ہے" ـــ یہ کہکر وہ خاموش ہوگیا اور سر جھکا کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لئے۔

میں نے دیکھا کہ دوسرے تمام لوگ بھی اسی طرح سر جھکائے' سینے پر ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ سامنے سے ایک گھوڑ سوار جس کے سر پر مختلف قسم کی کلغیاں لگی ہیں اپنے دونوں ہاتھوں سے چابک لہراتا شان سے چلا آرہا ہے۔ کچھ لوگ اس کے پیچھے پیچھے مُرچھل جھلاتے' تالیاں بجاتے چل رہے ہیں۔ وہ آدمی جس کے ہاتھوں میں بڑے بڑے چابک تھے رہ رہ کر دائیں بائیں دونوں طرف کھڑے لوگوں پر چابک برساتا میرے قریب آگیا۔ قریب آکر اُس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور میرے اوپر زور زور سے چابک برسانا شروع کردیا۔ میں خوف اور اذیت سے چیخنے لگا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری چیخ حلق سے باہر نہیں آرہی بلکہ میرے اندر بہت اندر ہی کہیں دفن ہو جارہی ہے ـــ اور صرف میرا منہ پھٹا ہے ـــ اِسی عالم میں میری آنکھ کھُل گئی اور میں نے دیکھا کہ میرا منہ اب تک پھٹا کا پھٹا ہے"۔

بولتے بولتے وہ چُپ ہوگیا۔ چپ رہتے رہتے رونے لگا۔ روتے روتے پھر بولا۔

"یار! خوابوں کا یہ سلسلہ بند نہیں ہوسکتا؟"

میں کیا جواب دیتا۔ خواب کسی کے بس میں کہاں ہیں؟

اندر کا جہنم

ٹُنڈ مُنڈ درخت کے نیچے آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے اس آدمی نے کپکپاتی ہوئی شہادت کی اُنگلی اوپر اٹھا کر دونوں نوواردوں سے پوچھا —— "تو تم لوگ آگئے؟"

"ہاں!" —— دونوں نوواردوں نے مودب لہجے میں جواب دیا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

دونوں نووارد اُس کے سامنے بیٹھ گئے۔ خاموشی پورے ماحول پر جبر کی طرح مسلط ہوگئی۔ پھر تیز اور چُبھتی ہوئی برفانی ہوائیں چلنے لگیں۔ تینوں آدمی یخ ہونے لگے۔ درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے آدمی نے پوری قوت سے ہونٹوں کو جنبش دے کر کہا: "اب منجمد ہو کر فنا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہو تو کہیں سے جا کر آگ لے آؤ تاکہ باہر کی اس ٹھنڈی یخ ہوا کا مقابلہ کیا جا سکے۔"

دونوں نووارد اُسی جگہ برف کی سِل کی مانند بیٹھے رہے۔ اُس آدمی نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "جاؤ۔ جاتے کیوں نہیں؟"

دونوں نوواردوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ان میں سے ایک آہستہ سے اُٹھا اور آگ کی تلاش میں نکل پڑا۔ بقیہ دو آدمی —— وہ اور ایک نووارد اُسی طرح بیٹھے رہے۔

تیز اور نوکیلی برفانی ہوائیں چلتی رہیں۔ ڈھیر سارا وقت ماضی کے برف خانے میں جا کر جمع ہوگیا۔ تب وہ نووارد جو آگ لانے گیا تھا بوجھل قدموں کے ساتھ واپس آیا اور آ کر گہری گہری سانسیں

لینے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے آدمی نے اس نووارد کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں کیا ہوا؟ آگ نہیں لائے"۔

"نہیں"۔

"آخر کیوں؟"

"اس واسطے کہ آگ کہیں تھی ہی نہیں"۔ —— خالی ہاتھ واپس آنے والے نووارد نے تھکن سے چُور لہجے میں کہنا شروع کیا —— "میں جب یہاں سے گیا تو مجھے راستے میں ایک لق و دق صحرا ملا۔ اسے عبور کرنے کے بعد مجھے ایک لامتناہی ریگستان سے گزرنا پڑا۔ ریگستان سے باہر نکلا تو انسانی آبادی کے کچھ آثار دکھائی دیئے۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس آبادی میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں کے لوگ مختلف قسم کے آزار میں مبتلا ہیں۔ کسی آدمی کا چہرہ برص کی طرح بالکل سفید ہے اور کسی کے چہرے پر نشان ہی نشان ہیں۔ کسی کی ایک آنکھ غائب ہے اور کسی کا ایک کان۔ بعضوں کے جسم سے پیپ بہہ رہی ہے اور بے شمار لوگ درد سے کراہ رہے ہیں۔ ایک آدمی کے پاس رُک کر میں نے اس سے کہا —— "بھائی! مجھے کہیں سے تھوڑی سی آگ لادو"۔

وہ آدمی کچھ بولا نہیں اور گھور گھور کر مجھے دیکھنے لگا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے پھر کہا۔ "اے مہربان! میں نے تجھ سے تھوڑی سی آگ مانگی تھی"۔

تب اس آدمی نے آنکھیں مٹکائیں اور بولا۔ "پہلے تم ہماری بستی کے بیمار لوگوں کا علاج کردو"۔

میں نے کہا۔ "اے برادر! میں نہ تو کوئی حکیم نہ کوئی طبیب —— میں کیونکر علاج کر سکتا ہوں؟"

"تم حکیم یا طبیب نہیں لیکن عیسیٰؑ ابنِ مریم تو ہو"۔

"نہیں بابا! میں ابنِ مریم نہیں ہوں"۔

"تم ابنِ مریم نہیں ہو؟" —— وہ پھر کچھ سوچنے لگا۔ پھر ذرا وقفے کے بعد بولا —— "معاف کرنا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ تم عیسیٰؑ ابنِ مریم نہیں موسیٰ کلیم اللہ ہو"۔

"نہیں ۔ میں موسیٰ بھی نہیں ہوں۔"

"تم موسیٰ ہو۔"

"نہیں۔"

"ہو۔"

"نہیں۔"

اور نہیں نہیں کہتے ہوئے میں نے وہاں سے بھاگنا شروع کر دیا۔ بھاگتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں بے انتہا شور تھا اور بے تحاشا روشنی۔ شور اتنا کہ کچھ سُنائی نہ دیتا تھا اور روشنی اس قدر کہ کچھ دکھائی نہ پڑتا تھا۔ میں اِدھر اُدھر دوڑتا پھرا لیکن آگ کہیں نظر نہ آئی ۔ بالآخر تھک ہار کر واپس آگیا۔"

ناکام واپس آنے والے نووارد نے اپنے سفر کی روداد ختم کی تو درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے آدمی نے دوسرے نووارد سے کہا۔ "یہ تو نامراد واپس آگیا۔ اب تم جاؤ۔"

دوسرا نووارد ہاتھ پیر کھینچ کر اُٹھا اور آگ کی تلاش کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ درخت کے نیچے بیٹھا ہوا آدمی اور ناکام واپس آنے والا نووارد اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ وقت آگے کی طرف سے سرک سرک کر پیچھے کی گپھاؤں میں گلیشیر بنتا رہا۔ اور جب یہ گلیشیر کافی بلند اور وسیع ہوگیا تو دوسرا نووارد بدحواس اور ملول سا واپس آیا۔ اُس کے ہاتھ بھی پہلے نووارد کی مانند خالی تھے۔ درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ "تم آگئے؟"

"ہوں"۔ نووارد نے زیرِ لب جواب دیا۔

"لیکن آگ کہاں ہے؟"

"آگ؟ ۔ آگ تو کہیں ملی نہیں۔"

"کیوں؟"

"ہوا یہ کہ یہاں سے نکل کر میں نیلے سمندروں میں گھر گیا۔ بڑی مشکلوں سے وہاں سے نکلا

تو مجھے ایک شخص نظر آیا جو ہاتھ میں چراغ لئے جا رہا تھا۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ" اے خضر صورت بزرگ! دن کی اس چمکتی ہوئی روشنی میں تم چراغ لئے کیوں پھر رہے ہو؟"

اس نے کہا۔" میں آدمی تلاش کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا۔" آدمی تلاش کر رہے ہو؟ یہ لو۔ میں آدمی ہوں۔"

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر مجھے دیکھا اور بولا۔" نہیں۔ تم آدمی نہیں۔ آدمی کا سایہ ہو۔"

میں نے کہا۔" خیر جو کچھ بھی ہوں۔ تم مجھے تھوڑی سی آگ دے دو۔"

اس نے یہ سُن کر پھونکوں سے اپنا چراغ گُل کر دیا اور سخت لہجے میں بولا۔" آگ لینی ہے تو جہنم میں جاؤ۔ وہاں تمہیں جتنی چاہو گے، آگ مل جائے گی۔"

پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور میں نے جہنم کا رُخ کیا۔ جہنم کے دروازے پر پہنچکر میں نے وہاں کے داروغہ سے عاجزی کے ساتھ گذارش کی۔" میں بہت دُور سے چل کر آ رہا ہوں۔ مجھے تھوڑی سی آگ جہنم کے اندر سے لا دو۔ بڑی مہربانی ہو گی۔"

جہنم کے داروغہ نے پہلے تو میرے سراپا کا بغور جائزہ لیا۔ پھر بولا۔" جہنم میں آگ کہاں؟ یہاں تو جو آتا ہے اپنی آگ خود اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔"

" یہ سُننے کے بعد میں وہاں سے سیدھے واپس آ گیا۔"

درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔" بیٹھ جاؤ۔"

دوسرا نووارد اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

باہر کی تیز ٹھنڈی ہوا میں بیٹھے وہ تینوں بہت دیر تک یخ ہوتے رہے۔

پھر پہلے نووارد نے کپکپاتے ہونٹوں سے سوال کیا۔" کیا واقعی آگ ہمارے اندر ہے۔ کہیں اور نہیں؟"

درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔" ہاں!"

اس پر دوسرے نووارد نے استفسار کیا۔ "تو کیا ہم سب جہنم ہیں؟"

ٹنڈ منڈ درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے آدمی نے اس سوال کو سنا مگر کوئی جواب نہیں دیا اور آلتی پالتی مار کر آنکھیں مُوند لیں۔

غیر تاریخی لمحات

شیشے کے پنجڑے میں قید چڑیا لمحہ لمحہ دانا چُگ رہی ہے۔

رات آدھی اِس پار ہے اور آدھی اُس پار۔

بالکونی میں کھڑا — وہ سگریٹ کے کش پہ کش لئے رہا ہے۔

سامنے کے فلیٹ کی عورت بستر پر لیٹی ہے اور اُس کا شوہر جُھوم جُھوم کر بڑے خلوص بڑی محبت سے اُس کے پاؤں دبا رہا ہے۔ پتہ نہیں یہ مرد کی تاریخ کا غیر تاریخی لمحہ ہے یا عورت کی تاریخ کا عین تاریخ ساز موقع؟

"نورجہاں نہایت خوبصورت اور خوب سیرت ملکہ تھی۔ مغلیہ دربار میں وہ شہنشاہ جہانگیر کے ساتھ بیٹھا کرتی تھی۔ حکومت کے نظم و نسق میں اُس نے بہت اہم اور موثر کردار ادا کیا۔ کیا عوام کیا خواص سبھی اُس کی ذہانت اور خداداد صلاحیت کے معترف تھے۔ شہنشاہ جہانگیر بھی ملکہ کی بہت عزت کرتا تھا۔۔۔۔"

بالکونی کے پیچھے اُس کا چھوٹا بیٹا میز پر جُھکا اپنا سبق یاد کر رہا تھا۔

بالکونی میں کھڑا — وہ دُوسرا سگریٹ جلاتا ہے۔

سامنے والی فلیٹ کی عورت بستر سے اُٹھتی ہے۔ اُس کا شوہر سینڈل سیدھی کر کے قدموں کے پاس رکھ دیتا ہے۔ عورت ایک ناز، ایک بے نیازی کے ساتھ پیروں میں سینڈل ڈال کر ملحقہ غسل خانے میں چلی جاتی ہے۔ اُس کا شوہر بے چینی سے ٹہلتا ہوا بار بار

غسل خانے کے دروازے تک جاتا ہے اور پھر اُسی بے چینی کے ساتھ واپس آجاتا ہے۔

"شہنشاہ شاہجہاں نے اپنے دورِ حکومت میں بہت ساری عمارتیں بنوائیں۔ ان عمارتوں میں سے ایک کا نام تاج محل ہے جس کا شمار دُنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔ یہ محل شہنشاہ شاہجہاں کی محبت کی یادگار ہے۔ شاہجہاں نے ملکہ ممتاز سے وعدہ کیا تھا کہ......"

بالکونی کے پیچھے اُس کا چھوٹا بیٹا میز پر جھکا تاریخ کا کچھ اور فاصلہ طے کر لیتا ہے۔ سامنے والے فلیٹ کی عورت غسل خانے سے واپس آگئی ہے۔ اُس کا شوہر بے قراری کے ساتھ اُس کے پاس آتا ہے۔ عورت اپنے ننگے گلے پر اُنگلیوں سے ہار کا نشان بنا کر سوالیہ نظروں سے شوہر کی طرف دیکھتی ہے۔ شوہر اثبات میں اپنی گردن ہلاتا ہے ۔ پھر وہ دونوں آہستہ آہستہ...... اب کچھ نظر نہیں آتا راستے میں کمرے کی دیوار حائل ہو گئی ہے۔

بالکونی میں کھڑا ۔۔۔ وہ جھلاہٹ کے ساتھ سگریٹ پھینک کر پاؤں سے مسلتا ہے اور پھر کمرے میں آکر بیوی کی طرف مسکرا کر دیکھتا ہے۔ بیوی پیار بھری خفگی سے بچّوں کی طرف اشارہ کر کے سوئٹر بُننے میں مشغول ہو جاتی ہے۔

کرسی میں دھنس کر ۔۔۔ وہ پھر سگریٹ سُلگا لیتا ہے۔

"آنکھ کا بیرونی خول غیر شفاف اور سخت ہوتا ہے جسے سفیدۂ چشم کہتے ہیں۔ اس کے مرکز میں ایک سوراخ ہوتا ہے جسے آنکھ کی پُتلی کہتے ہیں۔ تیز روشنی میں یہ سوراخ سُکڑ کر چھوٹا ہو جاتا ہے اور مدھم روشنی میں پھیل کر بڑا ہو جاتا ہے......"

اس کی چھوٹی بیٹی کتاب پر نظریں جمائے زور زور سے پڑھ رہی ہے۔

سگریٹ کو ایڑی سے مسلتے ہوئے ۔۔۔ وہ بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔

بیوی پھر بچوں کی طرف اشارہ کرکے سوئٹر کی بُنائی میں لگ جاتی ہے۔

"روشنی دراصل توانائی کی ایک قسم ہے جس کی مدد سے ہم چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ یہ ہمیشہ خطِ مستقیم میں سفر کرتی ہے۔ تجربہ گاہ میں اس اُصول کو ثابت کرنے کے لئے ....."

اچانک گھپ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہیں دیتا۔ سارے میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔

"بجلی چلی گئی۔ بجلی چلی گئی"

"یہ بجلی روز روز کیوں چلی جاتی ہے؟"

"بچوں کے اِمتحان ہو رہے ہیں اور کم بخت بجلی والے ....."

"لگتا ہے ٹرانسفارمر میں کوئی خرابی ہو گئی ہے"

"نہیں۔ پاور ہاؤس میں ہی کچھ گڑبڑ ہے اِس لئے کہ دُور دُور تک اندھیرے کے سوا کچھ دِکھائی نہیں دیتا۔"

"بچو تم سو جاؤ۔ بجلی اب جلد نہیں آنے کی ..." دُور و نزدیک کی مختلف آوازوں کے درمیان اُس کی بیوی کی آواز تاریکی میں اپنے بچوں سے مخاطب ہوتی ہے۔

تاریکی کے ساتھ ساتھ خاموشی بھی آہستہ آہستہ اِردگرد کی پُوری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

مگر شیشے کے پنجڑے میں قید چڑیا کے دانہ چگنے کی آواز اب بھی برابر آ رہی ہے۔

—ٹک ٹک۔ ٹک ٹک۔

سگریٹ جلاتے ہوئے ماچس کی تیلی کی روشنی میں وہ دیکھتا ہے کہ بچے اوندھے سیدھے اپنے اپنے بستر پر سو گئے ہیں۔ بیوی کی پنڈلیاں کھُلی ہیں مگر اُس کی آنکھیں بھی بند

ہیں۔ اُون کا گولا جس میں بُنائی کی تیلیاں پیوست ہیں اُس کے سرہانے پڑا ہے۔

کچھ دیر۔۔ وہ یوں ہی بیٹھا رہتا ہے۔ سگریٹ جل جل کر جب ختم ہو جاتا ہے تو وہ اس کے ناقابل استعمال ٹکڑے کو کھڑکی کے باہر پھینک کر دوسرا سگریٹ جلاتا ہے ــــ پھر تیلی کی روشنی میں شیشے کے پنجڑے کی جانب نگاہ کرتا ہے۔

چڑیا لمحہ لمحہ دانہ چُگ رہی ہے۔

تین چوتھائی رات اِس پار ہے اور ایک چوتھائی اُس پار۔

یکایک روشنی کسی وحشی درندے کی مانند چاروں طرف سے حملہ آور ہوتی ہے اور چپے چپے پر اپنے پنجے گاڑ دیتی ہے۔

اُس کی بیوی بچے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے ہیں۔

"سوتے میں بتیاں کس نے جلادیں؟" ــ اُس کی بیٹی آنکھیں مَلتی ہوئی سوال کرتی ہے۔

"بجھاؤ۔ جلدی بجھاؤ۔ یہ بھی کوئی وقت ہے روشنی کا؟" ــ بیوی کروٹ بدلتے ہوئے اُکتاہٹ سے چیختی ہے۔

ہاتھ بڑھا کر ــ وہ کھٹ کھٹ ساری سُوئچیں آف کر دیتا ہے اور اندھیرے میں دھم سے اپنے بستر پر گر جاتا ہے۔

شیشے کے پنجڑے میں قید چڑیا شاید اب بھی لمحہ لمحہ دانا چُگ رہی ہے.....

جنگل گُونجتا ہے

اُس کے ہاتھوں میں ایک دُو نالی بندوق ہے ـــــ اِس طرح کہ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی دستے کے نیچے ہے اور دائیں ہاتھ کی شہادت کی اُنگلی لبلبی پر۔

ایک آنکھ بند ہے اور دُوسری اَیرچرا اور مکھی کی سیدھ میں آگے دیکھ رہی ہے۔

آگے سبز گھنا جنگل ہے ـــــ اتنا سبز اور اتنا گھنا کہ پہلی نظر میں سیاہی کا سمندر دکھائی دیتا ہے۔

اُس کے دوسرے ساتھی شکار کی تلاش میں جنگل کے اندر اُتر گئے ہیں۔

شکاری شکار کی تلاش میں ہیں۔

شکار شکاریوں کی نظر سے بچتے پھر رہے ہیں۔

جنگل کے اندر دلدلی زمین پر شکار اور شکاریوں کی آنکھ مچولی جاری ہے۔

شکار تو شاید نہیں تھکتے لیکن شکاری اس آنکھ مچولی سے تنگ آکر ستانے کو بیٹھ جاتے ہیں۔

"آج ہمیں اب تک ایک بھی شکار نہیں ملا حالانکہ اتنی دیر میں ہم شکار کے ڈھیر لگا دیا کرتے تھے" ـــــ ٹھگنے قد والے شکاری نے مایوس لہجے میں کہا۔

"شاید اس لئے کہ جانور اب ہوشیار ہو گئے ہیں اور وہ شکاریوں کی آہٹ پاتے ہی کہیں چُھپ جاتے ہیں" ـــــ لمبے قد والے شکاری نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"شکار نہ ملنے کی وجہ جانوروں کی ہوشیاری نہیں تمہاری بے وقوفی ہے" ـــــ درمیانے

قد والے شکاری نے لمبے قد والے شکاری پر الزام لگایا۔

"وہ کیسے ؟" ــــ لمبے قد والے نے حیرت سے پوچھا ــــ

"گھر سے چلتے وقت تم نے چاقو چاقو کی رٹ شروع کر دی تھی حالانکہ شکاری ہونے کے ناطے تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ شکار پر روانگی کے وقت چاقو چھری اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا نام نہیں لیتے "ــــ

"ہاں ہاں! ہو سکتا ہے یہی وجہ ہو آج شکار نہ ملنے کی "ــــ ٹھگنے قد والے نے درمیانے قد والے کی تائید کی۔

" تمہیں میری غلطی تو نظر آگئی لیکن اس کی حماقت تمہیں نظر نہیں آئی " ــــ لمبے قد والے نے درمیانے قد والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ٹھگنے قد والے شکاری سے کہا۔

" میری حماقت ؟ وہ کیا ؟ " ــــ اب کے درمیانے قد والے نے حیرت سے پوچھا۔

" تمہیں بھی شکاری ہونے کے ناطے معلوم ہونا چاہئے کہ سفید کپڑے پہن کر شکار پر نہیں جایا کرتے۔ تمہاری یہ بگلے جیسی سفید شیروانی دیکھ کر تو یہی گمان ہوتا ہے کہ تم شکار پر نہیں بلکہ سسرال آئے ہو "ــــ

" واقعی! ایسے میں کیا خاک شکار ملے گا " ــــ اِس بار ٹھگنے قد والے نے لمبے قد والے کی ہاں میں ہاں ملائی۔

" ابے تو آدمی ہے یا تھالی کا بینگن ؟ " ــــ درمیانے قد والے نے ٹھگنے قد والے سے کہا۔

" کیوں، میں تھالی کا بینگن کیسے ہو گیا ؟ " ــــ ٹھگنے نے معصومیت سے سوال کیا۔

" اس لئے کہ تو میری بھی ہاں میں ہاں ملا رہا ہے اور اس کی بھی " ــــ لمبے قد والے نے اُسے جواب دیا۔

" اس کی وجہ یہ ہے کہ تم دونوں ہی سچی بات کہہ رہے ہو ــــ کبھی کبھی بہت سے آدمی سچی مگر ایک دوسرے سے مختلف باتیں کہتے ہیں اور ایک سچا آدمی بیک وقت ان سب کے سچے ہونے کی گواہی

دیتا ہے"۔

"فلسفہ مت بگھار ٹھگنے گھن چکر! تجھے اپنی حماقت تو نظر نہیں آتی اور چلا ہے دوسروں پر اُنگلی اُٹھانے"۔۔۔ لمبے قد والے نے تُرش لہجے میں کہا۔

درمیانے قد والے نے ٹھگنے قد والے کے تھیلے سے گولیاں نکال کر حقارت کے ساتھ ٹھگنے قد والے کے سامنے پھینکیں اور بولا۔۔۔ "اگر تجھے تیری حماقت نظر آتی تو تو چھرّے والی کارتوسیں لیکر شکار پر نہ آتا۔۔۔ چڑی مار کہیں کا!"

ٹھگنے قد والے نے ایک بار زور سے 'ہائیں' کہا اور خاموش ہو گیا۔

لمبے اور درمیانے قد والے بھی خاموش ہو گئے۔

سنّاٹے نے جب پوری طرح اپنے پاؤں جما دیئے تو ٹھگنے قد والا پھر گویا ہوا۔

"یارو! شکار تو مِلا نہیں اِس لئے اب اپنے اپنے تھیلے کھولو تاکہ ہم گھر سے لایا ہوا کھانا کھا کر اپنی بھوک مٹا سکیں"۔

"جنگل میں بھی گھر سے لایا ہوا کھانا۔۔۔ عجیب بات ہے"! لمبے قد والے نے آہستہ سے کہا۔

"گھر اور جنگل۔۔۔ جنگل اور گھر!۔۔۔ درمیانے قد والا کچھ سوچ کر زیرِ لب مُسکرایا۔ پھر تینوں کے ہاتھ خاموشی سے اپنے اپنے تھیلے کی طرف بڑھ گئے۔ تھیلے کے اندر سے انھوں نے اپنی اپنی پوٹلیاں نکالیں اور انھیں کھول کر کھانے میں مصروف ہو گئے۔۔۔ کھانا کھا کر لمبے قد والے نے تھیلے سے کاغذ کا ایک پُرزہ نکالا اور اسے غور سے دیکھنے کے بعد بولا۔

"اجازت نامے کے مطابق ہمارے شکار کا وقت اب ختم ہو رہا ہے۔ پھر بھی تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ اس کے بعد بھوری آنکھوں والے کو تلاش کریں گے۔۔۔ پتہ نہیں اُسے بھی کوئی شکار مِلا یا نہیں"۔

اُن تینوں نے ایک دوسرے کے سامنے اپنے پاؤں پھیلائے اور درختوں سے ٹیک لگا کر

نیم دراز ہو گئے۔

اُدھر وہ بھوری آنکھوں والا اُسی طرح کھڑا ہے۔

اُس کے ہاتھوں میں ایک دُونالی بندوق ہے ــــ اِس طرح کہ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی دستے کے نیچے ہے اور دائیں ہاتھ کی شہادت کی اُنگلی لبلبی پر۔

ایک آنکھ بند ہے اور دُوسری اُپر چڑا در مکھی کی سیدھ میں آگے دیکھ رہی ہے۔

آگے سبز گھنا جنگل ہے ــــ اتنا سبز اور اتنا گھنا کہ پہلی نظر میں سیاہی کا سمندر دکھائی دیتا ہے۔

وہ آدمی بندوق کی نال کو ذرا نیچے جھکاتا ہے اور بایاں ہاتھ دستے سے ہٹا کر کندھے کے ساتھ لٹکے ہوئے تھیلے میں ڈالتا ہے اور اس کے اندر سے کاغذ کا ایک پُرزہ نکال کر غور سے دیکھتا ہے ــــ کاغذ کا پُرزہ دیکھنے کے بعد تکدّر کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر گہری ہو جاتی ہیں۔

وہ کاغذ کے اس پُرزے کو تہہ کر کے پھر تھیلے کے اندر رکھ دیتا ہے اور اس کے اندر سے دُور بین نکال کر بندوق پر لگاتا ہے اور نال کو اُوپر اُٹھا کر پھر کھلی آنکھ کی سیدھ میں کر لیتا ہے۔

اب وہ نال کو آہستہ آہستہ دائیں سے بائیں گھُماتا ہے۔

ہر چیز صاف نظر آ رہی ہے ــــ رنگ برنگے پھُول ــــ چھتنار درخت ــــ ہوا میں ڈولتی لمبی لمبی خودرَو گھاس ......

وہ نال کو بائیں سے دائیں گھماتا ہے۔

ہر شئے نگاہوں کی زَد میں ہے ــــ پودوں میں لگے ہوئے جنگلی پھل ــــ پیڑوں پر بنے ہوئے گھونسلے ــــ شاخوں پر دوڑتی ہوئی گلہریاں ...... مگر شکار کا دُور دُور تک پتہ نہیں ہے۔

بندوق کی نال گھماتے گھماتے وہ ایک نقطے پر رُک جاتا ہے۔

سامنے محکمۂ جنگلات کا ریسٹ ہاؤس ہے جس کے آہنی گیٹ پر ایک باوردی

محافظ کھڑا ہے۔

نشانہ باندھ کر وہ اس پر ایک فائر کرتا ہے ـــــ "ٹھا"!

پھر دوسرا ـــــ "ٹھاآ"!

جنگل فائر کی آواز سے گونجنے لگتا ہے ـــــ اور سارا منظر دھواں دھواں

ہو جاتا ہے ـــ

صحرا بھی نہ چھوڑے

آسمان کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا۔

اور زمین قدموں تلے سے کہیں کھسک گئی تھی۔

جس جگہ وہ کھڑا تھا وہاں اُس کے سر پر آسمان کے بدلے لوہے اور تانبے کے تاروں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔

اور قدموں تلے؟ —— قدموں تلے بھی زمین کی بجائے تار ہی تار پھیلے ہوئے تھے۔

"کیا میں تاروں کے جال میں قید ہوں اور اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں؟"

اُس نے سوچا اور پھر بہت احتیاط کے ساتھ قدم آگے بڑھائے جیسے تاروں میں اُلجھنے سے ڈر رہا ہو۔

آگے بڑھ کر وہ ایک اور چوراہے پر کھڑا ہو گیا جہاں سے اُوپر تلے بہت سے تار مختلف سمتوں میں دوڑتے ہوئے گھروں میں داخل ہو رہے تھے۔

اُوپر بجلی اور ٹیلی فون کے تار —— ایک دوسرے کے متوازی اور ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے نیچے پانی، گیس اور نہ جانے کس کس چیز کے پائپ اور وائر —— ایک دوسرے میں گھستے اور آگے پیچھے دھکیلتے ہوئے۔

"کیا گھروں کی بنیاد انہی پائپوں اور تاروں پر قائم ہے اور ان کے بغیر گھر کا تصوّر ممکن نہیں؟"

اُس کے اپنے ذہن سے اُبھرا ہوا سوال اُس کے اپنے ہی ذہن میں سوئیوں کی طرح چبھنے

لگا۔ اس چُبھن سے چھٹکارا پانے کے لئے اُس نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا —— سر کو جھٹکا دیتے ہوئے اُس کی نظریں اُوپر کی طرف اُٹھ گئیں —— جہاں ایک کوّا بجلی کے تار میں اُلٹا لٹکا ہوا تھا۔

اُس نے گھبرا کر آنکھیں میچ لیں مگر تار میں لٹکے ہوئے مُردہ کوّے کا منظر بچی ہوئی آنکھوں کے اندر بھی در آیا —— اُس نے اپنی آنکھیں دونوں ہتھیلیوں سے زور زور سے مَل کر کھول دیں —— تار سے لپٹا ہوا سیاہ منظر اب بھی اُس کی بینائی کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا اور دوسرے چوراہے پر آ گیا —— یہاں سے بھی پائپ اور تار ایک دوسرے میں گھُستے اور ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ بجلی کے تار والا سیاہ منظر اب بھی اُس کی آنکھوں سے چپکا ہوا تھا۔ اپنی نظروں کو اس سیاہ منظر کے عذاب سے نجات دلانے کے لئے اُس نے ایک اخبار خریدا تاکہ اپنی بینائی کو لفظوں اور لکیروں کے طلسم میں گُم کر دے۔

"شہر کے عین وسط میں بجلی کا بڑا ٹرانسفارمر پھٹ جانے سے پندرہ افراد ہلاک —— پچیس زخمی۔"

پہلے صفحہ پر سہ کالمی سُرخی دیکھ کر اُس کی سانسیں اُلجھنے لگیں اور اُس نے گھبرا کر دُوسرا صفحہ اُلٹ دیا۔

"گیس کے چُولھے سے دوؔ عورتیں جاں بحق —— ایک بچی جھُلس گئی۔"

دُوسرے صفحہ پر دوؔ کالمی سُرخی تھی۔

اُس نے تیسرا صفحہ کھولا۔

"تیز رفتار ٹرک ٹیلی فون کے کھمبے سے ٹکرا کر اُلٹ گیا —— ڈرائیور اور آٹھ مزدوروں کی حالت نازک۔"

—— تیسرے صفحے پر حاشئے کے اندر خبر کی سُرخی تھی۔

اُس نے ہڑ بڑا کر آخری صفحہ اُلٹ دیا —— آخری صفحے پر با تصویر خبر تھی۔

"پٹرول کے ذخیرے میں بھیانک آتش زدگی ....."

اِنتہائی جھلاہٹ کے ساتھ اُس نے اخبار مروڑ کر فضا میں اُچھال دیا۔ اخبار نیچے گر کر پائپوں اور تاروں کے درمیان پھڑ پھڑانے لگا۔

اُس نے کھڑے کھڑے کچھ سوچنے کی کوشش کی مگر اُس سے کچھ سوچا نہیں گیا۔ وہ اُسی طرح کھڑا رہا۔

اُس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں، اُوپر نیچے، ہر طرف تاروں اور پائپوں کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔

"جنگل!"

اچانک ایک خیال بجلی کی مانند اُس کے ذہن میں کوندا اور وہ سرپٹ بھاگنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے جب وہ بہت دُور نکل آیا تو اُس نے دیکھا کہ سامنے سے ایک آدمی کھویا کھویا، بُجھا بُجھا سا چلا آ رہا ہے۔

جب وہ آدمی اُس کے سائے کی حدود میں داخل ہو گیا تو اُس نے پوچھا ـــــ

"تم کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں جاؤ گے؟"

"پیچھے سے آ رہا ہوں اور آگے جاؤں گا" ـــ اُس آدمی نے گہری گہری آواز میں جواب دیا۔

"پیچھے کہاں سے آ رہے ہو اور آگے کہاں جاؤ گے؟"

"کچھ پتہ نہیں ـــــ صرف اتنا معلوم ہے کہ پیچھے سارے جنگل کٹ گئے ہیں اور....."

"جنگل کٹ گئے؟" ـــــ اُس نے حیرت اور مایوسی کے ساتھ سوال کیا۔

"ہاں! اور اب وہاں بھی ایسی ہی بستیاں آباد ہو گئی ہیں جیسی کہ تم یہاں دیکھ رہے ہو۔"

"وہاں بھی ایسی ہی بستیاں؟" ـــــ اُس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

جنگل کی طرف سے آنے والا آدمی اجنبی اور نامعلوم منزلوں کی تلاش میں آگے بڑھتے

بڑھتے تاروں اور پائپوں کی اوٹ میں معدوم ہو گیا۔

اور وہ پھر وہاں اکیلا رہ گیا۔

اُس کے اوُپر نیچے، دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر طرف تاروں اور پائپوں کا لامتناہی سلسلہ تھا اور گدلا سیاہ دھواں۔

آسمان کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا۔

اور زمین قدموں تلے سے کہیں کھسک گئی تھی۔

اس نے بہت سوچا کہ کیا کرے کدھر جائے لیکن اُس سے کچھ سوچا نہ گیا۔

خلا کی مانند سائیں سائیں کرتے ذہن کے ساتھ وہ بے ٹھکانا سا وہیں کھڑا رہا —

اور کھڑا کھڑا زور زور سے ہانپنے لگا جیسے بڑی لمبی مسافت طے کر کے آرہا ہو —

ترسے ہوئے آئینے

آگے پیچھے، دائیں بائیں — ہر طرف شیشے ہی شیشے ہیں —
اور لڑکا شیشے کی ان دیواروں کے بیچ رقص کر رہا ہے۔
(تیتری کہسار پر یلغار کر رہی ہے!)

"ناحق کیوں اپنی توانائی ضائع کرنے پر تُلے ہوئے ہو؟ تمھیں اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔"
"میں اگر کچھ حاصل بھی کر لوں تو مجھے اس کی خوشی نہ ہوگی کیونکہ حصول اور بے حصولی دونوں ہی اپنے لیے کرب کا باعث ہیں۔"
"لیکن جان بوجھ کر خود کو بے حصولی کے عذاب میں کیوں مبتلا کرنا چاہتے ہو؟"
"اس لیے کہ یہی ہمارا مقدر ہے۔ ہم اپنے نتیجوں سے باخبر امتحان کے میدان میں اُترتے ہیں۔"
"اور تمھیں اس نتیجے کی نوعیت بھی معلوم ہے؟"
"ہاں! کربلا — مہابھارت — اور....."
"پھر بھی تم اپنی اس سعیٔ لاحاصل سے باز نہیں آتے؟"
"نہیں یہ ممکن نہیں — میں ہتھیار نہیں رکھ سکتا۔"
"ناموافق نتیجے سے باخبر ہوتے ہوئے بھی جنگ جاری رکھنا کہاں کی دانشمندی ہے؟"
"تم اسے چاہے جو بھی نام دے لو — لیکن اس کے سوا کچھ بھی میرے بس میں نہیں۔"

لڑکا شیشے کی دیواروں کے بیچ رقص کر رہا ہے۔
(تتلی پہاڑ سے نبرد آزما ہے!)

"وہ قافلہ جو تم سے پہلے ادھر سے گزرا تھا اُس نے کیا کیا تم اس سے واقف ہو؟"

"اُس نے یہاں اپنے خیمے لگائے۔ کچھ دنوں قیام کیا، جدوجہد کی آگ روشن کی اور پھر درد اور مسافت کی گرد اپنے چہرے پر سجائے یہاں سے رخصت ہوگیا۔"

"اور اب یہاں دُور دُور تک اس کا نام و نشان بھی نہیں۔"

"ایسا نہ کہو۔ جب وہ یہاں آئے تھے تو ہر شے ان کے وجود سے لرز اٹھی تھی اور اب بھی کہ وہ یہاں سے جا چکے ہیں ان کے سانسوں کی مہک فضا میں رچی ہوئی ہے۔ ہم اپنے زندہ لہو سے اس خوشبو کی توسیع کر رہے ہیں۔"

"یعنی الگ سے تمھارا اپنا کوئی وجود نہیں۔ تم محض آبِ رواں کی ایک درمیانی موج ہو۔"

"وہ جو اس راہ پر آگے گئے اور وہ جو بعد میں آئیں گے میں ان دونوں کے درمیان تعلق کی طاقت ہوں۔ تم اسے طاقت کا تعلق بھی کہہ سکتے ہو۔"

"جنگ میں درمیان سے شریک ہونے والوں کی کیا اہمیت؟"

"وہ جو صرف کامیابی کے تمغے اپنے سینوں پر سجانے کے آرزومند ہوں، درمیانی لڑائی ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ہمارے لیے اعزاز یہی ہے کہ ہم جنگ کو جاری رکھیں۔ اسے کس نے شروع کیا تھا اور اُس وقت اس کی حکمتِ عملی کیا تھی اس سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں اور نہ اس سے ہے کہ بعد میں شریک ہونے والے کیا طریقۂ کار اپنائیں گے۔"

"اس طرح بھی کہیں جنگ لڑی جاتی ہے؟"

"ہر سپاہی کو اپنے فرض کا خیال رکھنا چاہیے اور بس۔"

"مگر ایسی جنگ کا نتیجہ معلوم۔"

کہا کہ نتیجے کی ہمیں کوئی پروا نہیں۔ ہم اس کی اذیت سے آگاہ ہو کر بھی میدان نہیں چھوڑتے۔"

لڑکا شیشے کی دیواروں کے بیچ رقص کر رہا ہے۔
(چیونٹی آہنی ستون سے برسرِ پیکار ہے!)

"تم خواہ مخواہ اپنے آپ کو ضایع کر رہے ہو کہ اس کا کچھ حاصل نہیں۔ لوگ بھلا ہار جانے والوں کو یاد بھی کہاں رکھتے ہیں؟"

"جیتنے والوں کو یاد رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہارنے والوں کو بھی یاد رکھا جائے۔"

"تمھارے لیے اس عبرت ناک شکست سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں جس کا تمھیں پہلے سے ہی یقین ہے؟"

"تم اسے شکست کہتے ہو — ہم اسے اپنی فتح سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنے چہروں کو رسوائی اور بے داغی کی ان خراشوں سے بچا لیا ہے جو مقابلہ نہ کرنے کی صورت میں ہمارے چہروں پر لگتیں۔"

"فائدے میں نقصان کی بجائے تم نقصان میں فائدے کے اصول کے حامی ہو؟"

"مدِ مقابل کی کم ہوتی ہوئی توانائی اپنی بڑھتی ہوئی قوت کا ہی ایک پہلو ہے۔"

"مگر یہ کیا بات ہوئی کہ تمھارے تمام ساتھی ایک ایک کر کے تمھیں چھوڑتے جا رہے ہیں۔ اور تم تنہا ہر وار کا مقابلہ کرنے کی کوشش میں لہولہان ہوتے جا رہے ہو؟"

"ہماری شان اور روایت یہی ہے۔"

"کیا تمھیں اس میدانِ کارزار میں اترنے سے پہلے بھی اس روایت اور شان کا احساس تھا۔ یا جب تمھارے پیش روؤں نے زبردستی تمھیں اس معرکے میں حصہ لینے پر مجبور کیا تو اس وقت تم اس سے واقف ہوئے؟"

"تم مجھے پھر غلط سمجھ رہے ہو یا جان بوجھ کر ایسا ظاہر کرنا چاہتے ہو۔ ہم میں سے ہر کوئی یہ بات

اچھی طرح جانتا ہے کہ اُسے اس مقابلے میں یکہ و تنہا ہی حصّہ لینا ہے۔"

"اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے؟"

"بالکل ـــ یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔"

"سیدھی طرح کہنے سے تو یہ حماقت ہوئی نا؟"

"تم اسے حماقت گردانتے ہو ـــ ہم اسے ناگزیر فرض سمجھتے ہیں ـــ یہ بھی تو خیال کرو کہ اگر ہم مقابلے سے دست بردار ہو جائیں تو ان سارے رنگوں اور خوشبوؤں کا کیا بنے گا جو ہمارے ہی دم سے چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔"

"فرض قرار دے کر تم اپنی جنگ کو مقدس کہلوانے پر اصرار کر رہے ہو۔"

"نہیں ہرگز نہیں ـــ ہمارے لیے مقدس یا حقیر لفظ کا وجود ہی بے معنی ہے۔ ہم اسے محض فرض سمجھتے ہیں۔"

"تو پھر پیہم حملے برداشت کرتے رہو۔ سنگینوں کی بارش تمھیں سر اُٹھانے کی بھی مہلت نہیں دے گی۔"

"مجھے معلوم ہے ـــ مجھے معلوم ہے لیکن جنگ بہر حال جاری رہے گی ـــ بغیر کسی وقفہ کے جنگ جاری رہے گی...."

رقاصہ ناچتے ناچتے تھک کر نیچے گر گیا ہے۔
آئینے عکس کو ترس گئے ہیں۔

ـــــــ ۶ ـــــــ

اُچھلے جل کی مچھلی

سارا شہر کرفیو کا کفن اوڑھے سو رہا تھا۔

رات بہت ڈراؤنی اور پُراسرار ہو گئی تھی۔ ہر چیز سانس روکے دم بخود تھی۔ اس بھید بھری خاموشی میں صرف بوٹوں کی آواز وقفے وقفے سے ڈنکے کی چوٹ کی مانند بلند ہوتی اور پھر رفتہ رفتہ کہیں تحلیل ہو جاتی۔ اچانک ایک انسانی چیخ اُبھری اور خوف و احتیاط کے سارے پردے چیر کر گلی گلی بین کرنے لگی۔

میں نے تکیئے سے سر اٹھا کر پہلے آواز کی سمت متعین کی اور پھر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا اس سمت میں چلنے لگا جدھر سے چیخ کی آواز آئی تھی۔ چند ہی قدم چلنے کے بعد وسوسے کی سنگینوں نے مجھے چاروں طرف سے آگھیرا۔۔ اگر کسی نے اس گھور اندھیرے کے باوجود میرا اُٹھا ہوا سر دیکھ لیا۔ یا میرے وجود کی آہٹ محسوس کر لی تو؟ ۔۔ انجام کا تصور زیادہ مشکل نہیں تھا۔

انجام کا خیال آتے ہی میں نے اپنا سر نیہوڑا لیا اور زمین پر جُھک کر کسی زخمی جانور کی طرح گڑگڑ کنے لگا۔ خوف کی چیونٹیاں اب بھی میرے اندر رینگ رہی تھیں۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے زمین پر رکھ کر پاؤں پیچھے کی طرف پھیلا دیئے اور زمین کے سینے سے سینہ ملا کر آگے بڑھنے لگا۔

گدلے تالاب کے اس پار بانس کی جھاڑیوں کے درمیان گھری جھونپڑی سے

چیخیں اب بھی رہ رہ کر اُبھر رہی تھیں۔

جھونپڑی کے دروازے پر پہنچکر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ دروازہ کھُلا تھا۔ اور عین دروازے کے سامنے ایک دُبلا پتلا سا آدمی ایستادہ تھا جس کے چہرے پر خوف اور دہشت کی دھُول اُڑ رہی تھی۔ اُس کی پشت پر دو لڑکیاں تھیں۔ خوف زدہ ہرنیوں کی طرح سہمی اور دبکی ہوئی اور ان کے پیچھے سراسیمگی کی تصویر بنی ایک ادھیڑ عمر کی عورت۔ ان سے ذرا ہٹ کر دو نوجوان پستول تانے کھڑے تھے۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی دُبلے آدمی کی آنکھوں میں اُمید کا سورج طلوع ہوا مگر دونوں نوجوانوں کے چہرے پر ناگواری کے سانپ لہرانے لگے۔

"تم یہاں کیسے آمرے؟" — ایک نوجوان نے بارد بھری آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"یہی سوال میں تم سے کرنے آیا ہوں۔" میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہم؟" — دوسرا نوجوان مکروہ سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "ہم ان لڑکیوں کو لینے آئے ہیں۔" ہرنیوں کی مانند سہمی ہوئی لڑکیاں تیز ہوا کی زد پر آئے ہوئے درخت کی کمزور کچی شاخوں کی مانند تھرتھرانے لگیں۔

"لیکن میں تمہیں ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گا۔" میں نے اپنے اندر کی ساری قوت اور سارا اعتماد سمیٹ کر کہا۔

"یہ غدار کی لڑکیاں ہیں اور ہمارے لئے مالِ غنیمت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تمھیں ان سے کیا واسطہ؟" — ایک نوجوان نے اپنی پستول کو اُنگلیوں سے سہلاتے ہوئے کہا۔

"تم شاہی قبیلے کے فرد ہو اور یہ غدار ماہی قبیلے کا آدمی ہے...." دوسرے نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں شاہی قبیلے کا فرد نہیں ہوں۔" میں نے سختی سے اس کی تردید کی۔

"تم شاہی قبیلے کے نہیں ہو پھر بھی تمہارا تعلق اسی قبیلے سے بنتا ہے۔ ماہی قبیلہ تمہارے اور شاہی قبیلے کے خلاف ہے اس طرح ...."

"میں کسی قبیلے کا نہیں ہوں۔ کوئی قبیلہ میرا نہیں ہے"۔ میں نے بلند آواز میں کہا۔ "یا میں ہر قبیلے کا ہوں۔ ہر قبیلہ میرا ہے ۔ مگر کان کھول کر سُن لو۔ میں تمہیں وہ ہرگز نہیں کرنے دوں گا جو تم قبیلے کے نام پر کرنا چاہتے ہو۔"

"غدّار!" ۔ اُن میں سے ایک نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں ابھی اس غدّاری کا مزا چکھاتا ہوں۔" دوسرا نوجوان پستول لہراتا ہوا آگے بڑھا مگر قبل اس کے کہ وہ مجھے گولیوں کا نشانہ بنائے میں نے اُسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میں نے دیکھا دُبلے پتلے آدمی نے بھی دوسرے نوجوان کو دبوچ لیا تھا ۔ دونوں لڑکیوں نے شیرنی کی طرح جھپٹ کر نوجوانوں کے ہاتھوں پر جن میں انھوں نے پستول پکڑی ہوئی تھی اپنے دانت گاڑ دیئے ۔ وہ دونوں اچانک چیخ پڑے اور ان کے ہاتھوں سے پستولیں تقریباً ایک ساتھ ہی زمین پر گر پڑیں ۔ پستول ہاتھ سے چھوٹ جانے کے بعد ان کا سارا دم خم ہوا ہوگیا اور وہ غصّے اور نفرت سے مجھے گھُورنے لگے ۔

"فوراً یہاں سے دفعان ہو جاؤ اور پھر کبھی بھُولے سے بھی اِدھر کا رُخ نہ کرنا" ۔ میں نے کہا وہ دونوں اپنے زخمی ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے سہلاتے' دانتوں کو پیستے ' دروازے سے نکل کر باہر اندھیرے میں کہیں ڈوب گئے ۔

دُبلا پتلا آدمی آگے بڑھ کر مجھ سے بغل گیر ہوگیا ۔

"میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھُول سکتا۔" اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور گردن جیسے کسی بوجھ سے دَبی جا رہی تھی۔ "یہ میری بہن ہے" ۔ اُس نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا ۔ "اور یہ میری بیٹی" ۔ اس نے دوسری لڑکی کی جانب اُنگلی اٹھائی دونوں لڑکیوں نے ایک لحظے کو میری طرف دیکھا اور پھر نظریں جھُکا لیں ۔

اچانک موسم تبدیل ہوگیا۔ طوفان کا رُخ اب دوسری سمت میں تھا۔ ہر طرف آہ و بکا اور نالہ و شیون کی آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ بارود اور انسانی خون کی بو پھیل رہی تھی۔ میں نے کئی دن تک سورج کی روشنی اور آسمان کی نیلاہٹ نہیں دیکھی۔ اور پھر ایک دن طوفان میرے دروازے پر دستک دینے لگا۔

"تم غدّار ہو۔ تم نے ہمارے قبیلے کے خلاف سازش کی ہے۔"

"تم دلال ہو۔ تمہیں دلالی کی سزا بھگتنی ہوگی۔"

میں گُم سُم کھڑا رہا۔ میں نے کس کے خلاف سازش اور کس کی دلالی کی تھی، مجھے معلوم نہ تھا۔

"چُپ کیوں کھڑے ہو؟"

"چلو۔ اِسے غدّاروں کی آخری آرام گاہ میں لے چلو۔"

"نہیں۔ تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اس نے کوئی دلالی، کوئی سازش نہیں کی۔" تالاب کے اُس پار رہنے والے دُبلے پتلے شخص نے پھولی سانسوں کے ساتھ کہا جیسے کہیں دُور سے دوڑ کر آ رہا ہو۔

"اس نے ہمارے دُشمنوں کا ساتھ دیکر ہم سے غدّاری نہیں کی؟"

"نہیں۔ اگر یہ ایسا کرتا تو آج میں تمہیں منھ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔"

جب طوفان ٹل گیا تو میں نے اُس آدمی سے کہا۔ "تم مجھے کب تک اس طوفان سے بچا سکوگے اس نے میرا گھر دیکھ لیا ہے۔ آج نہیں تو کل مجھے پھر آلے گا۔ بہتر یہی ہے کہ میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جاؤں۔"

اس نے اپنی زبان بند رکھی اور قدموں کو حرکت دی۔ میں نے بھی اس کے ساتھ قدم اُٹھائے اور ہم دونوں بانسوں کے جھُنڈ کے درمیان تالاب کے کنارے آکر کھڑے ہو گئے۔ رنگ برنگی مچھلیاں تالاب میں اِدھر سے اُدھر دوڑ لگا رہی تھیں۔ اُس نے مچھلیوں

کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یوں تو ایک سے ایک مچھلیاں ہوتی ہیں لیکن مجھے سب سے زیادہ سلیمانی مچھلیاں پسند ہیں۔" وہ چلا گیا۔ اور جب دوبارہ آیا تو اس کا سارا وجود رُسوائیوں کے داغ سے لہولہان تھا۔

"کیا ہوا؟ تمہیں کس سانپ نے ڈس لیا؟"

"آستین کے سانپ نے۔"

"آستین کے سانپ نے؟"

"ہاں! طوفان اب بگولا بن گیا ہے۔ کوئی گھر اس سے محفوظ نہیں رہا۔ اس اندھے طوفان نے مجھے میری ماں جائی اور میرے خون کے پیکر سے جدا کر دیا ہے۔.... وہ لوگ میری بہن اور بیٹی کو....."

"لیکن وہ تو تمہارے اپنے قبیلے کے....."

"پاگل کسی کو کب پہچانتے ہیں....." اُسے چپ سی لگ گئی۔

"کیا تم نے شاہی قبیلے میں جانے کا واقعی فیصلہ کر لیا ہے؟" اس نے ذرا ٹھہر کر سوال کیا۔

"ہاں! یہاں تو اب اپنا سایہ بھی خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔"

"میں بھی اس قبیلے کو خیرباد کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے؟" تالاب کے کنارے آ کر مچھلیوں کو گھورتے ہوئے اس نے بڑی حسرت کے ساتھ پوچھا۔ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"تمہیں تو سلیمانی مچھلیاں پسند تھیں....." میں اس سے کہنا چاہتا تھا۔ "میں بھی ایل مچھلیوں کا پرستار ہوں لیکن....."

لیکن میں خاموش رہا اور نظریں پانی پر جما دیں۔ مبادا اس کے ہاتھ سے موہوم سا وہ آخری تنکا بھی چھوٹ جائے جسے حرزِ جاں بنائے ہوئے میں اب تک زندہ تھا۔

سُولی پر لٹکی ہوئی آواز

پورے گھر کو سانپ سُونگھ گیا ہے۔ کوئی کچھ بولتا نہیں۔ سب کے سب — میرے بیٹے، بیٹیاں، بیوی اور بوڑھی ماں سائبان میں گھیرا ڈالے کھڑی ہیں۔ درمیان میں پنجرا رکھا ہے — پنجرے میں طوطا بیٹھا ہے — اپنی سُرخ چونچ کو سبز پروں میں چھپائے۔

"کیا ہوا؟ کون سی آفت ٹوٹ پڑی ہے؟" — میں اس اسرار کو جاننے کے لئے سوال کرتا ہوں۔

کوئی مجھے میرے سوال کا جواب نہیں دیتا۔

میرے بیٹے، بیٹیاں، بیوی اور بوڑھی ماں — سب اُسی طرح گھیرا ڈالے خاموش کھڑی ہیں۔

ماں مجھے نظریں اُٹھا کر دیکھتی ہے مگر اُس کی نظریں بھی کچھ نہیں کہتیں — وہ بھی اس کے ہونٹوں کی طرح خاموش ہیں۔

"کوئی کچھ بولتا کیوں نہیں؟ کیا کوئی بلا گھر میں گھس آئی ہے جس نے سب کی زبانیں گنگ کر دی ہیں"؟ — میں اُکتاہٹ کے ساتھ تقریباً چیخنے کے انداز میں کہتا ہوں۔

اس بار میری بیوی اپنی پلکوں کی جھالر اُوپر اُٹھا کر مجھے دیکھتی ہے لیکن اس کی نیلی جھیل جیسی آنکھیں بھی شہر خموشاں کا منظر لئے ہوئے ہیں۔

میں اپنی نظروں کی شعاعیں باری باری اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے چہرے پر پھینکتا ہوں۔۔۔۔

مگر ان پر بھی کوئی ردِ عمل نہیں ہوتا۔ ان کے ہونٹوں، چہروں بلکہ پورے وجود پر بھی سکوت طاری ہے۔

پھر میرا چھوٹا بیٹا گھیرے سے نکل کر میرے پاس آتا ہے اور آکر میرے قدموں سے لپٹ جاتا ہے۔ میں اپنے بازوؤں میں اُٹھا کر اُسے چومتا ہوں۔

"کیا ہوا میرے بیٹے میرے لعل! آج تم لوگ چُپ کیوں ہو؟" ۔۔۔۔ میں اُس سے پوچھتا ہوں۔

"مِتّو گونگا ہو گیا ابو! کچھ بولتا نہیں" ۔۔۔۔ میرا بیٹا رُونی صورت بنا کر مجھے بتاتا ہے۔

میرے بیٹے کو پرندوں سے بڑی محبت ہے۔ پرندوں کے بغیر وہ رہ ہی نہیں سکتا اِسی لئے کوئی نہ کوئی پرندہ گھر میں ہمیشہ موجود رہتا ہے ۔۔۔۔ یہ طوطا بھی کوئی سال بھر پہلے اسی کی ضد پر لایا گیا تھا۔ اُس وقت یہ بالکل بچہ تھا۔ اس سے پہلے میری بیوی نے ایک بڑا طوطا بجرا سمیت خرید کر لایا تھا ۔۔۔۔ میرے بچوں نے بہت کوشش کی کہ اسے کچھ بولنا آجائے لیکن اُسے بولنا نہیں آیا۔

میری ماں بچوں کو سمجھاتی ۔۔۔۔ "یہ طوطا نہیں بولے گا بچو! بڈھے طوطے پوس نہیں مانتے۔ تم لوگ خواہ مخواہ اپنا وقت خراب کر رہے ہو۔"

بچے اپنی کوشش میں لگے رہے مگر طوطے نے ایک لفظ بھی بولنا نہیں سیکھا۔ وہ ہر وقت پنجرے کے اندر کودتا پھاندتا اور اس کے آہنی تاروں کو کاٹنے کی کوشش کرتا رہتا۔ چند دنوں بعد اُس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ۔۔۔۔ اور بالآخر ایک روز مر گیا۔

اس کے کچھ روز بعد میری ماں طوطے کا ایک بچہ کہیں سے لے آئی۔ بچوں نے اِسے پڑھانا شروع کیا ۔۔۔۔

"نبی جی روزی بھیجو ــــ نبی جی روزی بھیجو۔"

کئی ہفتے تک طوطا کچھ نہیں بولا پھر آہستہ آہستہ کرچنے لگا ــــ ماں کہتی تھی یہ طوطا ضرور بولے گا ــــ اور واقعی کرچتے کرچتے ایک دن بولنے لگا ــــ

"نبی جی روزی بھیجو ــــ نبی جی روزی بھیجو۔"

بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگے ــــ پھر اُنھوں نے اسے اگلا سبق پڑھانا شروع کیا ــــ

"پیر فقیر اُٹھا بستر ــ چل مکے کی زیارت کو۔"

چند دنوں میں طوطا بھی صدا لگانے لگا ــــ

"پیر فقیر اُٹھا بستر ــ چل مکے کی زیارت کو۔"

رفتہ رفتہ وہ بہت سی باتیں سیکھ گیا ــــ جیسے ہی کوئی مہمان گھر میں داخل ہوتا وہ زور زور سے بولنے لگتا ــــ

"آیئے آیئے ــــ تشریف لایئے۔"

بچے جب اسکول سے واپس آتے تو وہ نعرے لگاتا ــــ

"گڈو راجہ اسکول سے آ گئے ــــ کھانے کو دو ــ کھانے کو دو۔"

"گڑیا رانی بھی آ گئیں ــــ ان کے لئے بھی کچھ لاؤ ــ ان کے لئے بھی کچھ لاؤ۔"

میں جب شام کے وقت دفتر سے لوٹتا تو آواز بلند کرتا ــــ

"بیگم صاحبہ! صاحب آ گئے ــ بریف کیس رکھئے ــ پانی گرم کیجئے۔"

اذان کی آواز سنتے ہی پکارنے لگتا ــــ

"اذان ہو گئی ــ دادی اماں کو وضو کے لئے پانی دو۔"

طوطا، طوطے سے زیادہ گھر کا ایک فرد بن گیا تھا ــــ کبھی کبھی جب اُسے کھانا ملنے میں دیر ہو جاتی تو وہ اپنی چونچ تاروں کے بیچ سے باہر نکال کر کہتا ــــ

"سب لوگ تو کھا چکے ــــ اب میری کٹوری میں بھی چنا دیدو۔"

میری ماں طوطے کی آواز سُن کر بچّوں پر برسنا شروع کر دیتی

"ارے کیا ہو گیا تم لوگوں کو؟ مٹھو کو اب تک چنا نہیں دیا ــــ اللہ معاف کرے۔ تم لوگ بے زبان پرندے کو تکلیف دیتے ہو۔"

عجیب بات تھی کہ طوطا آدمیوں کی طرح بولتا تھا پھر بھی میری ماں اُسے بے زبان پرندہ ہی کہتی تھی۔

پنجرے کا دروازہ اگر کبھی کھُلا رہ جاتا تو بھی وہ اُڑ کر کہیں جاتا نہیں بلکہ باہر نکل کر آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا تھا۔ ایسے میں کبھی کوئی بچّہ اُسے پھر پنجرے میں ڈال کر دروازہ بند کر دیتا۔ کبھی وہ خود ہی سارے گھر میں گھوم پھر کر پنجرے میں واپس چلا جاتا۔

شام کو جب میں دفتر سے واپس آتا تو وہ چہکنے لگتا ــــ

"بیگم صاحبہ! صاحب آ گئے۔ بریف کیس رکھئے ــ پانی گرم کیجیے۔"

گھر میں میرا استقبال سب سے پہلے یہ طوطا ہی کرتا تھا لیکن آج جب میں واپس آیا ہوں تو پورے گھر کو سانپ سُونگھ گیا ہے۔ کوئی کچھ نہیں بولتا۔ سب کے سب ــــ میرے بیٹے، بیٹیاں، بیوی اور بوڑھی ماں سائبان میں گھیرا ڈالے کھڑی ہیں۔ درمیان میں پنجرا رکھا ہے ــــ پنجرے میں طوطا بیٹھا ہے ــــ اپنی سُرخ چونچ کو سبز پروں میں چھپائے ــ

"کیا ہوا؟ ــــ آخر ہوا کیا؟" ــــ میں پھر بیزاری کے ساتھ قدرے بلند آواز میں پوچھتا ہوں۔ وہ سب گھیرا توڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔

پھر میری بیوی میرے قریب آ کر مجھے بتاتی ہے ــــ

"صبح سویرے یہ اچھا خاصا چہک رہا تھا۔ نبی جی روزی بھیجو ــــ پیر فقیر اُٹھا بستر چل مکّے کی زیارت کو......" وہ ذرا دیر کو رُکی۔ ایک نظر طوطے پر ڈالی پھر میری طرف نگاہ کر کے بولی ــــ "میں نے اس سے کہا کہ میاں مٹھو پُرانی رَٹ کب تک لگاتے رہو گے۔ اَب یہ بولو کہ صاحب کی ترقی ہو جائے۔ صاحب ہمیں رزق دیتے

ہیں۔ وہ .....“ میری بیوی بولتے بولتے ایک بار پھر رُکی ـــــ پھر جھلاہٹ اور افسوس کے ساتھ بولی ـــ ”اس کے بعد سے اس نے ایک دانہ بھی نہیں کھایا اور اپنی چونچ پَروں میں دَبا کر بیٹھ گیا ہے۔“

مَیں بیوی کی بات سُننے کے بعد اپنے ہونٹوں کو سِکوڑ کر منہ سے طوطے جیسی آواز نکالتا ہوں۔ طوطا پَروں کے اندر سے اپنا سر نکال کر لمحے بھر کو میری اور میری بیوی کی طرف غصّے اور نفرت سے دیکھتا ہے ـــــ اور پھر اپنی سُرخ چونچ سبز پَروں کے اندر ڈال کر گُم ہو جاتا ہے ـــــ

پورے گھر کو ایک بار پھر سانپ سُونگھ گیا ہے۔

تیسری آنکھ

میں نے اسے حیرت کے زاویئے سے دیکھا۔ وہ کوئی اور نہیں میری اپنی بیوی تھی۔

"میں اپنے کنوارے جسم کی قسم کھا کر کہتی ہوں....."

راہباؤں کی سی سنجیدہ یہ آواز اس عورت کی تھی جس سے میرا رشتہ ہی ازار بند کا ہے اور جو گذشتہ تین سال سے بلاناغہ ہر رات میرے بستر کی ایک ایک شکن کی شریک رہی ہے۔

اپنی بیوی کی یہ بات سُن کر میری عقل کے سارے سوتے جیسے مفلوج ہو گئے اور میں بے بسی کے عالم میں بے تحاشہ قہقہے لگانے لگا ـــــ ہاہاہا..... ہاہاہا!

"احمقوں کی طرح قہقہے نہ لگاؤ۔" اس نے بے شکن لہجے میں کہا اور دونوں ہاتھوں سے کنڈوم اور ڈایافرام کے کئی خالی کئی بھرے پیکٹ میرے چہرے کی طرف اُچھال دیئے۔ تب میری دونوں آنکھیں ندامت کے پانی سے بھیگ بھیگ کر مُندنے لگیں اور تیسری آنکھ آہستہ آہستہ کھلنے لگی لیکن قبل اس کے کہ یہ پوری طرح کھل پاتی' دروازے پر بڑی بے چین سی دستک ہونے لگی۔ میں نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ دستک دینے والا شخص بے دھڑک اندر آ گیا۔

"میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" اُس نے کہا۔

"لیکن کہاں؟"

"یہ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

"آخر کیوں؟"

"تم اس سے بھی واقف ہو جاؤ گے۔"

پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگا۔ چلتے چلتے ہم ایک محل نما عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ یہ ایک حسین اور فلک بوس عمارت تھی جس کے چاروں طرف محل کی دیواروں سے بھی اونچا سنگی حصار کھنچا ہوا تھا۔ اس سنگی حصار کے گرد مسلح اور چاق وچوبند سپاہیوں کی ایک فصیل کھڑی تھی۔

مجھے اُس شخص نے محل کے اندر ایک بہت بڑے کمرے میں لے جاکر کھڑا کر دیا۔ میں نے اپنی نگاہیں اٹھاکر دیکھا۔ ایک بہت بڑی اور اونچی سی کرسی پر ایک نہایت چھوٹا آدمی، کرسی کے ہتھے مضبوطی سے تھامے بیٹھا تھا۔

میرے ساتھ والے آدمی نے کرسی پر بیٹھے ہوئے آدمی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر کہا۔

"ظلِ سبحانی، حاکم جاودانی ــــ سلطان عالم، معمار اعظم ــــ فرشتۂ عنایات، عقل کائنات ...."

وہ اسی طرح نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ لیکن میں یہ الفاظ یاد نہ رکھ سکا۔ کیونکہ ان میں سے بیشتر میرے لئے قطعی اجنبی تھے۔ لفظوں کی برات رُکی تو اس شخص نے گہری سانس لی اور پھر ذرا دم لے کر بولا: "مژدہ ہو کہ یہ شخص اپنی ان دیکھی نسل کے بوجھ سے بیزار ہے اور خوش وخرم زندگی گزار رہا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج یہ قہقہہ لگاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔"

"بہت خوب ــــ بہت خوب ــــ" حاکم شہر کے چھوٹے سے سر پر رکھے ہوئے بڑے سے تاج میں لرزش پیدا ہوئی۔ "اے میری خوش حال قوم کے زندہ دل فرزند! مابدولت تجھ سے بہت خوش ہوئے ــــ مانگ تو کیا مانگتا ہے؟"

"میرے مہربان آقا! بندہ جان کی امان کے بعد ایک سوال کا جواب چاہتا ہے۔"

"بولو ــــ" پورا ایوان نرم دل آقا کی کرخت آواز سے لرزنے لگا۔

"سوال یہ ہے کہ میری ذاتی اور نجی باتوں کا علم اس آدمی کو کیسے ہوا؟"

سُورج مکھی کی مانند اس شخص نے جو مجھے اپنے ساتھ لایا تھا، حاکم شہر کی طرف دیکھا۔

"اس سوال کا جواب دیا جائے ـــ" حاکم نے حکم صادر کیا۔

"اے میرے عزیز ہم وطن! تو نے سُنا ہوگا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں ظلِ سبحانی نے شہر کی تمام دیواروں میں سچ مچ کے کان اور آنکھیں لگوادی ہیں تاکہ رعایا کی خبر گیری کی جا سکے تمہیں اس بات کے لئے حضورِ پُر نور کا ممنون ہونا چاہیئے کیونکہ اسی میں تمہارا اور تمہاری قوم کا مفاد ہے۔"

سو میں نے اپنے اور اپنی قوم کے مفاد میں سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اس کے عوض میری بھاری تنخواہ مقرر ہوگئی اور مجھے یہ کام سونپا گیا کہ میں شہر کے ہر چوراہے پر کھڑا ہو کر دن بھر قہقہوں کی بارش کرتا رہوں تاکہ ان نافرمان باغیوں کا منہ بند کیا جا سکے جو یہ کہتے تھے کہ ایک بڑی نحوست ہم پر مسلط ہوگئی ہے جس نے ہمارے لبوں سے ہماری مسکراہٹیں چھین لی ہیں۔ شہر کے لوگ ہنسنا بھُول گئے ہیں اور بچے اس لفظ سے قطعاً نا آشنا ہیں۔

میں اس الزام کو جھُوٹا ثابت کرنے کے لئے ہر موڑ، ہر چوراہے پر قہقہے اُنڈیلنے لگا۔ لوگ تعجب سے مجھے دیکھتے اور ہمدردی کی سوئیاں میرے وجود میں چبھو کر آگے بڑھ جاتے جیسے میں کوئی پاگل ہوں۔ ایک دن ایک بچے کو حیرت سے اپنی طرف تکتے ہوئے دیکھ کر، ہنستے ہنستے اچانک میری آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے اور میں رونے لگا۔ حاکمِ شہر کو اس کی خبر ہوگئی اور اس نے دربار میں بُلا کر مجھ سے کیفیت طلب کی۔

"کیا تم باغیوں سے مِل گئے ہو؟ صاف صاف بتا دو ورنہ ....."

"بندہ پرور! آپ کو یہ گمان کیسے ہوا کہ آپ کا یہ غلام نمک کا ذائقہ بھول سکتا ہے؟"

"تو کیا یہ غلط ہے کہ قہقہوں کی بجائے سرِ بازار تمہاری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے؟"

"حضورِ عالی! یہ بالکل سچ ہے۔ لیکن وہ خوشی کے آنسو تھے۔ انسان جب حد سے زیادہ

خوش ہوتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔"

میری یہ بات حاکم کے دل کو لگی اور اس نے میری دانش مندی سے متاثر ہو کر مجھے اپنا مشیرِ خاص مقرر کر لیا۔ اب میرے سپرد یہ کام ہوا کہ میں شہریوں کے لئے معلومات اور تفریح کا سامان فراہم کروں۔

سو میں نے ہر گھر میں ایک شیشے کا گھر مہیا کر دیا جس کے پردے پر چیلی، البیلی عورتیں جب اپنے شیشے جیسے شفاف اور چمکتے ہوئے جسم کے ساتھ نمودار ہوتیں تو دیکھنے والے اپنا دل تھام کر سسکاریاں بھرنے لگتے۔

ہوا کے دوش پر گھر گھر پہنچنے والی آوازیں کانوں سے ہوتی ہوئی ناف کے نیچے تک جسم کی ہر رگ کو چھیڑتیں ورغلاتیں۔

کورے کاغذ کا سینہ رنگ برنگ کے ناپاک لفظوں کی سلاخ سے داغ داغ کر جھوٹ کے بے لباس ہر کارے ہر طرف دوڑا دیئے گئے۔

شہر اب شہر نہیں رہا بلکہ ایک آوارہ کشتی اور ایک منہ زور جیّو کی علامت میں ڈھل گیا تھا۔

ہر فرد کو راشن کے ساتھ وہ جھلیاں بھی مفت تقسیم کی جا رہی تھیں جو ماں کی کوکھ کی خدمت انجام دے کر گمراہیوں کے نشان مٹاتی اور انسان کا بوجھ کم کرتی تھیں۔ شرپسند باغیوں کی کسی بات کا اثر اب لوگوں پر نہیں ہو رہا تھا۔

حاکم شہر ہر طرح مطمئن و مسرور تھا۔ لیکن میرے اپنے ہی منصوبے کے مطابق جب شیشے کا گھر روشن ہوتا یا ہوا کے دوش پر سفر کرنے والی آوازیں میرے کانوں پر دستک دیتیں یا اُجلے کاغذ کا داغ داغ سینہ نظروں کے سامنے آتا تو میرے پورے جسم میں ایک انجانے خوف کا سیال گردش کرنے لگتا اور میرے ہونٹوں پر ایک دُعا ایک فریاد تڑپنے لگتی۔

"اے سارہ! اے سیتا!! اے مریم!!! تمہیں تمہاری پاک دامنی کی قسم۔ ہماری ماؤں

بہنوں اور بیٹیوں کی آبرُو رکھنا .....“

لیکن ایک دن جب میں اپنے فرائض انجام دے کر گھر واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری بیوی گھر سے غائب ہے ــــ اور سنگھار میز پر رکھی ہوئی میری تصویر رنگ رنگ کی لجلجی جھلیوں میں ڈُوبی ہوئی ہے۔

دُکھ اور تاسف کے بوجھ سے میری دونوں آنکھیں مُندنے لگیں ــــ مگر ٹھیک اسی سمے تیسری آنکھ کے دریچے جیسے اچانک روشن ہو گئے۔

پسپائی کا آخری موڑ

میرے دوسرے بھائی ٹانگیں پسارے آرام سے سو رہے تھے اور صرف مَیں جاگ رہا تھا کہ وہ آپہنچے۔ میں نے انھیں اپنے اتنا قریب دیکھ کر حیرت سے پوچھا — "تم لوگ کون ہو؟"

"ہم پاس والے جزیرے کے رہنے والے ہیں۔" ان میں سے ایک نے مختصر سا جواب دیا۔

"لیکن اِس وقت یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

"ہم تمہارے پاس اِس لئے آئے ہیں کہ تم ہمارے لئے سونے کا ایک محل بنا دو۔"

مجھے اس بات پر ہنسی آئی لیکن اپنی ہنسی ضبط کرکے میں نے کہا —

"مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اتنی دُور جا کر تمہارے لئے سونے کا محل تعمیر کردوں؟"

"بات یہ ہے کہ پانی ہمارے کچّے مکانوں کو روز روز بہالے جاتا ہے جس سے ہم بہت پریشان ہیں۔ اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ سونے کا ایک محل بنوالیں تاکہ ہماری زندگیاں اور ہمارے اثاثے سب محفوظ ہو جائیں۔" ایک نے ابھی بات مکمل بھی نہ کی تھی کہ دوسرے نے کہنا شروع کیا —

"تم ہمارے پڑوسی ہو اور اس کام میں مہارت رکھتے ہو اس لئے تمہارا فرض ہے کہ تم ہماری مدد کرو۔"

جب ان میں سے ہر ایک نے پہلے فرداً فرداً اور پھر ایک ساتھ مل کر میری بڑی خوشامدیں کیں اور اپنے بیوی بچوں کا واسطہ دیا تو میں راضی ہو گیا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔

وہاں پہنچ کر میں نے سونے کے محل کی بُنیاد رکھی اور اس کی تعمیر شروع کردی۔ جیسے جیسے محل کی دیواریں اونچی ہوتی گئیں اور اس کے نقش و نگار واضح ہوتے گئے وہ میری کاریگری، اور مہارت کے قائل ہوتے گئے۔ برسوں کی لگاتار محنت کے بعد آخر کار وہ محل مکمل ہو گیا۔ وہ سب بہت خوش ہوئے اور خوشی سے ناچنے اور گانے لگے۔ جشن کی محفل ختم ہوئی تو میں تھکن سے چُور ہو کر وہیں محل کے ایک سائبان میں سو گیا ___ نہ جانے کب تک یوں ہی سوتا رہتا کہ معاً کسی نے جھنجھوڑ کر مجھے اُٹھا دیا ___

"ارے یہ یہاں کیوں سویا ہوا ہے۔ ہمارے محل پر قبضہ کرے گا کیا؟" ___ سانولے رنگ کے ایک دُبلے پتلے آدمی نے ہاتھ لہرا کر کہا۔

"نکالو نکالو ___ اِسے یہاں سے نکالو" بہت سی آوازیں کھلے خنجر کی طرح فضا میں لہرانے لگیں۔

"بہت تھک گیا ہوں۔ ذرا آرام کر لوں" ___ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ نہیں" ___ ہوا میں تیر سنسنانے لگے۔

میں نے بہت منّت سماجت کی۔ ہاتھ جوڑے، پاؤں پکڑے لیکن انھوں نے میری ایک نہ سُنی اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے گھسیٹنے لگے۔ انھوں نے اتنا گھسیٹا اتنا گھسیٹا کہ میرا سارا وجود لہو میں تر ہو گیا اور انگ انگ سے کراہ بلند ہونے لگی۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا ___ اور جب کچھ ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں لیکن کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ میں بہت حیران ہوا اور دونوں ہتھیلیوں سے مَل مَل کر آنکھوں کے جالے صاف کرنے لگا۔ پھر بھی بہت دیر تک مجھے کچھ دکھائی نہ دیا نہ کوئی آواز ہی سنائی دی۔ کہیں میرے حواس مجھ سے جُدا تو نہیں ہو گئے؟ ___ خوف کا ایک جھکڑ چلا اور میں لرز گیا۔ پھر ذرا ٹھہر کر میں نے اپنے تمام حواس کا جائزہ لیا۔ آنکھیں، ناک، کان ___ ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ تو یہ جو میں کچھ دیکھ اور سُن نہیں پا رہا ہوں اس میں میرے حواس کا کوئی قصور نہیں اندر سے سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ باہر سے رابطہ ختم ہو جانے کی وجہ

شاید یہ ہو کہ باہر کی دُنیا میں تبدیلی آگئی ہے یا اُس کی ترسیلی قوت ختم ہو گئی ہے اور ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ باہر کی دُنیا سرے سے ہو ہی نہیں۔

میں پھر زور زور سے اپنی آنکھیں مَلنے لگا۔ یہاں تک کہ یہ پانی سے جل تھل ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ آنکھوں کے سامنے دھند سی چھانے لگی ۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میں دُھند کو دیکھ سکتا ہوں۔ دُھند کا پردہ ہٹا تو میں نے دیکھا کہ ہر طرف تاریکی کی دَلدل پھیلی ہوئی ہے اور مختلف سمتوں سے آئی ہوئی سائیں سائیں کرتی جنگلی ہوائیں ایک دوسرے پر غلبہ پانے کیلئے برسرِ پیکار ہیں۔

"یہ ہوائیں کہاں سے آتی ہیں اور کہاں جاتی ہیں؟" کسی نے بے آواز لہجے میں سوال کیا اور پھر یہ سوال پھانسی کے پھندے کی مانند میرے پورے وجود سے لپٹ گیا۔

"ہوائیں بے وطن ہیں اور گردش ان کا مقدّر ہے۔" میرے میں نے مجھے پھندے کی کی اذیّت سے نجات دِلانے کی کوشش کی۔

ہوائیں اُسی طرح سنسناتی ہوئی گردش کرتی رہیں۔

پھر ہوا کے ایک جھونکے نے آکر مجھ سے پوچھا ۔ "ہمارے معصوم خوابوں کے محافظ تم ہم سے جُدا کیوں ہو گئے؟"

دوسرے جھونکے نے دریافت کیا ۔ "میرے شب و روز کے ہمسفر میں اب کس کے سہارے اپنا سفر طے کروں؟"

تیسرے جھونکے نے سوال کیا ۔ "میری آنکھوں کی بینائی! تم کب واپس آؤ گے؟"

دُور دیس سے آئی ہوئی ان ہواؤں کے مانوس لہجے نے مجھے ریزہ ریزہ کر دیا۔

پھر میں نے اپنے بکھرے ہوئے ریزوں کو یکجا کیا اور جسم و جان کی پوری قوت سے چلایا "میں یہاں ہوں۔ میں یہاں ہوں۔" لیکن میری یہ چیخ کہیں نہیں پہنچ سکی کیونکہ فوراً ہی بعد یہ میرے اپنے ہی کانوں سے آکر ٹکرا گئی ۔ "میں یہاں ہوں۔ میں یہاں ہوں۔"

میرے سلگتے وجود سے انگارے نکلنے لگے۔ میں ان انگاروں کو اپنی زبان سے چاٹتا

رہا لیکن انگارے تھے کہ ختم ہونے ہی کو نہ آتے تھے ــــ ہوتے ہوتے یہ انگارے میری زبان کا سارا لعاب چاٹ گئے اور میرا وجود ایک بار پھر ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگا۔ اب مجھ میں اپنے بکھرتے ہوئے وجود کو سمیٹنے کی صلاحیت بھی معدوم ہو چکی تھی۔

باہر اندھیرے کی دلدل اُسی طرح قائم تھی۔

جنگلی ہوائیں سائیں سائیں کرتی پھر رہی تھیں۔

اور میں لمحہ لمحہ بکھر رہا تھا۔

پھر جب انتہائی نڈھال ہو کر میں زمین سے چپک گیا اور اپنی بے نُور آنکھوں سے سُورج کے اُبھرنے کا انتظار کرنے لگا ــــ تو کہیں سے ندا آئی کہ زمین طلوع ہو رہی ہے۔

مصلوب نسلیں

میرے سامنے خلا میں ایک ہیولا سا بن گیا ہے۔ یہ ہیولا آہستہ آہستہ ایک انسانی چہرے کا رُوپ دھار لیتا ہے ایسے انسانی چہرے کا جسے میں پہچان نہیں پاتا۔ جس کا نام بھی مجھے معلوم نہیں!

(چہروں کو ہم اُن کے نام کے حوالے سے پہچانتے ہیں یا ناموں کو چہرے کے حوالے سے؟ مجھے اپنے ذہن پر سوال کا دباؤ محسوس ہوتا ہے۔)

پھر وہی کچھ پہچانا پہچانا سا اجنبی چہرہ میرے سامنے آگیا ہے۔ میں اپنے ذہن پر زور دے کر اس چہرے سے اجنبیت کے نقوش کھرچ کر اسے پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔

یہ تو میرے باپ کا چہرہ ہے!

(مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ کیا باپ بھی اسم اعظم ہے؟ خوشی اسمِ اعظم میں ہے، یا پہچان میں؟)

اچانک خوشی کافور ہو جاتی ہے اور مجھے اپنے باپ کے چہرے سے خوف آنے لگتا ہے۔

(میں اپنے باپ کا مقروض ہوں؟ کیا ہر بیٹا اپنے باپ کے قرض کا بوجھ اُٹھائے پھرتا ہے؟؟)

اس چہرے پر رنج و غم کے بہت ہی گہرے سائے ہیں۔ اسے شکایت ہے کہ میں اپنی ماں یعنی اس کی بیوی کا خیال نہیں رکھتا۔

(میری ماں، میری ماں ہے یا اس کی بیوی؟ اگر وہ میری ماں ہے تو خیر، لیکن اگر وہ اس کی بیوی ہے تو مجھے کسی کی بیوی کا خیال رکھنے کی کیا ضرورت ہے — ؟؟ پھر یہ کہ میرے باپ نے اس عورت کو میری ماں بنا لیا ہے یا میری ماں نے اس مرد کو میرا باپ ؟؟؟ ذہن پر سوالوں کی زنجیر کا دباؤ بڑھ گیا ہے!)

"ہٹ جاؤ، مجھے کسی کی بیوی کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے نہ فرصت!" میں پوری قوت سے چیختا ہوں۔ لیکن آواز گھٹ کر رہ جاتی ہے۔

(مجھے اس گھٹی ہوئی آواز پر اپنی آواز ہونے کا یقین نہیں آتا۔ بھلا اپنا اس حد تک غیر ہو سکتا ہے؟)

اس کے چہرے پر لکیروں کا جال کچھ اور گہرا ہو جاتا ہے۔

"تم نے میری بیٹی یعنی اپنی بہن کا بیاہ غلط آدمی سے کر دیا۔ وہ اسے بہت مارتا پیٹتا گالیاں دیتا اور اذیتیں پہنچاتا ہے۔ مجبور ہوں، کچھ کر نہیں سکتا۔ تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہوں!"

میرا باپ مجھ پر فردِ جرم عاید کرنے کے ساتھ ساتھ مجھی سے رحم کی اپیل بھی کر رہا ہے۔

(یہ بھی کتنی عجیب بات ہے!)

"تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ تمہاری بیٹی ہے ہی اسی لائق۔ شوہر اسے پیٹے گا نہیں تو اور کیا کرے گا؟"

(میری بیوی بھی میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔ میں اسے جھٹک جھٹک کر توڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن یہ بے غیرت زنجیر ٹوٹتی ہی نہیں۔ لچک لچک کر رہ جاتی ہے۔)

"تمہیں اپنی ماں سے مطلق محبت نہیں۔ بیماری کی حالت میں تم اس کا علاج تک نہیں کراتے۔ اور نہ ہی تیمارداری کرتے ہو۔!"

وہ چہرہ الفاظ بدل کر فردِ جرم کو دہراتا ہے!

"ماں سے زیادہ محبت ہونی بھی نہیں چاہیئے!"

(میرا باپ اوڈی پس کمپلکس سے واقف نہیں۔ مجھے اس کی ناواقفیت کے احساس سے خوشی ہوتی ہے ۔ سچی خوشی اپنی آگہی سے پیدا ہوتی ہے یا دوسروں کی ناواقفیت کے احساس سے؟)

"میری لڑکی کو تم نے ایک ایسے کھونٹے پر باندھ دیا ہے جو کسی طرح اس کے لئے مناسب نہیں تھا۔"

ایک بار پھر الفاظ بدل کر وہ فردِ جرم کی دوسری شق دہراتا ہے۔

(اپنے آپ کو دُہرانے کا عمل خیال کی تنگی کے باعث ہوتا ہے یا جذبات کی شدّت کے باعث؟)

"کوئی کھونٹا کسی کے لئے مناسب نہیں ہوتا!"

(میرے سُسر، یعنی میری بیوی کے باپ کو بھی یہ شکایت ہے کہ اس کی بیٹی کو غلط کھونٹے میں باندھ دیا گیا ہے۔ شاید میرے نانا یعنی میری ماں کے باپ کو بھی یہی شکایت رہی ہو۔)

"میری بیوی — میری بیٹی — آہ!"

چہرے پر کرب کی بے شمار خراشیں نمودار ہو گئی ہیں۔

"ایک آدمی کتنی نسلوں کا بوجھ سہار سکتا ہے؟ ذرا اپنے بارے میں سوچو۔ تم نے کتنے ہی کام میرے لئے نامکمل چھوڑ دیئے ___ شاید تم یہ کہو کہ تمہارے باپ نے بہت سارے نامکمل کام تمہارے ذمّے کر دیئے تھے ۔ تو میں بھی اب اپنے ادھورے کام اپنے بیٹے کے سپرد کر جاؤں گا۔ پھر میرا بیٹا اپنے بیٹے کو........ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔ کیونکہ پہلے بھی چلتا رہا ہے۔ تسلسل کی اس زنجیر کو توڑا نہیں جا سکتا۔ پھر تم مجھ سے شاکی کیوں ہو؟"

اس کے چہرے پر پشیمانی اور ندامت کی بوندیں تھرتھرانے لگتی ہیں۔ ناتکمیلی کی خلش زخموں کی طرح ٹیس دینے لگتی ہے۔

پھر وہ چہرہ آہستہ آہستہ پگھلنے لگتا ہے۔ اور قبل اس کے کہ وہ پگھل کر بالکل فنا ہو جائے اور میری آنکھوں کے سامنے ایک بے رنگ، بے نشان خلا پھر سے پھیل جائے۔ ایک اور چہرہ ۔ اس سے کچھ مشابہ، کچھ مختلف اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ میں اس چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔

"ارے! یہ تو میرا اپنا چہرہ ہے۔"

مجھے اپنے چہرے کو پہچان کر بے انتہا خوشی ہوتی ہے۔

(خوشی صرف اپنی پہچان میں ہے؟ اسی کو گیان کہتے ہیں؟)

میں اپنے چہرے کو غور سے دیکھنے لگتا ہوں۔ خود اپنا چہرہ دیکھنا مجھے بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

(کہیں نرگسیت ہی اصل حقیقت تو نہیں؟)

پھر میرا چہرہ دھندلانے لگتا ہے۔ اور بہت سارے جانے پہچانے اور انجان چہرے ۔ میرے اپنے چہرے سے مشابہ بھی اور مختلف بھی خلا میں ڈولنے لگتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں، یہ تمام چہرے ایک دوسرے کو شکایت اور خوف بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اور ـــ اور ان سب کے پیچھے ایک بڑی سی سیاہ صلیب ہے اور صلیب کے بازوؤں پر لاتعداد کیلیں رکھی ہوئی ہیں۔

"ہر چہرے کے لئے صلیب ایک ہی ہے ـــ صرف کیلیں بدلتی رہتی ہیں۔"

(کیا چہرے اور صلیب کا رشتہ ازلی و ابدی ہے؟ ذہن پر سوال کا دباؤ بے انتہا بڑھ گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے اب میرا دماغ ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔!)

بینا نابینا

پہلا آدمی چھڑی سے ٹک ٹک کرتا مالاباری ہوٹل میں داخل ہوا اور پنکھے کے نیچے کونے والی سیٹ پر جاکر بیٹھ گیا۔ ہوٹل کا بیرا فوراً اس کے پاس پہنچا اور سنگی میز کو گندی صافی سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"کیا کھاؤ گے؟"

چھڑی والے آدمی نے اپنی چھڑی کو اطمینان سے میز پر رکھ کر کہا۔ "پانی لاؤ۔"

بیرا اندر باورچی خانے کی طرف گیا اور پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس لاکر میز پر پٹختے ہوئے بولا۔

"اور کیا لاؤں؟"

چھڑی والے آدمی نے جگ اُٹھایا اور گلاس میں پانی ڈالنے لگا۔ کچھ پانی گلاس کی بجائے میز پر گر گیا۔ اُس نے جگ کی پوزیشن بدلی اور گلاس بھر کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا۔ بیرا کھڑا انتظار کرتا رہا۔ جب اُس نے پورا گلاس ختم کر کے اسے میز پر رکھ دیا تو بیرے نے پھر پوچھا۔

"اور کیا آرڈر ہے؟"

"ٹھہرو۔ ابھی ہمارا ایک اور آدمی آنے والا ہے۔"

بیرا منھ بناتا ہوا دوسری میز کی طرف چلا گیا۔ اتنے میں دوسرا آدمی سیاہ چشمہ لگائے دھیرے دھیرے چلتا ہوا میز کے پاس آیا اور داہنے ہاتھ کی ہتھیلی سے میز کو تھپتھپانے لگا۔

"ہاں بیٹھو۔" پہلا آدمی پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

دوسرے آدمی نے میز کے نیچے سے کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا۔ ابھی وہ کوئی اور بات نہ

کر پائے تھے کہ بیرا پھر آن پہنچا۔ "اب تو دو گے آرڈر۔ بتاؤ کیا لاؤں؟"

پہلے آدمی نے دوسرے آدمی کو مخاطب کر کے پوچھا۔ "چائے پیو گے؟"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے کچھ کھاؤں گا۔" دوسرے آدمی نے جواب دیا۔

"اچھا تو پہلے دو روٹی اور ایک نہاری لے آؤ۔" پہلے آدمی نے بیرے سے کہا۔

بیرا آرڈر لے کر چلا گیا تو دوسرے آدمی نے پہلے سے پوچھا۔

"تم بہت دیر سے انتظار کر رہے تھے کیا؟"

"نہیں۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔" پہلے نے کہا۔

"اور سب سناؤ۔ کیا حال ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔ ایک دم فسٹ کلاس۔"

"آج دھندا کیسا رہا؟"

"بہت اچھا۔"

بیرا روٹی اور نہاری لا کر رکھ گیا۔ دوسرے آدمی نے پہلے سے کہا: "آجاؤ تھوڑا سا تم بھی۔"

"نہیں۔ بالکل خواہش نہیں۔ میں پہلے ہی جم کر کھا چکا ہوں۔"

"اوہو۔ کیا بات ہے۔ کوئی قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا تھا کیا؟"

"نہیں۔ قارون کا خزانہ تو نہیں ملا۔ ایک حاتم طائی مل گیا تھا آج۔"

"حاتم طائی؟"

"ہاں!"

"اپنا دھندا تو آج بالکل مندا تھا۔ صبح سے دوپہر تک اسٹیشن پر کھڑا رہا۔ لیکن بوہنی بھی نہیں ہوئی۔" دوسرے آدمی نے روٹی کا لقمہ نہاری میں بھگو کر منھ میں رکھا۔ "دوپہر کے بعد ٹاور کے پاس آ گیا۔ مگر یہاں پر بھی کوئی خاص آمدنی نہیں ہوئی۔ دن بھر میں صرف پانچ روپے ہوئے ہیں۔"

اتنے میں تیسرا آدمی ہوٹل میں داخل ہوا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر کی اور پھر کوئی میز

خالی نہ پاکر اُسی میز پر آگیا جس پر پہلے اور دوسرے آدمی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔

بیرا تیسرے آدمی کے پاس آیا۔" کیا لاؤں صاب؟"

"چائے"۔

بیرے نے چائے کی پیالی لاکر اُس کے سامنے رکھ دی۔ اور وہ آہستہ آہستہ چائے کی چسکی لینے لگا۔

"میں آج سپر مارکیٹ کے قریب تھا"۔ پہلے آدمی نے کہنا شروع کیا۔" وہاں پر میری بھی کوئی خاص آمدنی نہ ہوئی۔ بس دو تین روپے ہوئے ہوں گے۔ لیکن شام کے وقت مغرب سے ذرا پہلے چمکتی ہوئی نئی گاڑی میں ایک آدمی آیا۔ وہ کچھ دیر یوں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا جیسے کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ پھر میرے پاس آیا اور بولا۔" بابا دُعا کر دو کہ میرا مال بخیر و خوبی پار ہو جائے"۔ اس نے پچاس روپے کا ایک نوٹ مجھے دیا اور پھر وہی بات دُہرائی ۔۔ "بس بابا دُعا کر دو"۔

"پچاس روپے؟ اس مہنگائی کے زمانے میں؟"۔ دوسرا آدمی حیرت سے بولا۔" کون آدمی تھا وہ؟"۔۔۔

"بس حاتم طائی سمجھو"۔

تیسرا آدمی پہلے اور دوسرے آدمی کی گفتگو چُپ چاپ غور سے سُنتا رہا۔

"ایک حاتم طائی کی بچّی تو مجھ سے بھی ٹکرائی تھی" ۔۔۔ دوسرے آدمی نے اپنی روداد شروع کی ۔۔ "میٹنی شو کے بعد سینما سے نکلی تھی۔ اس کے ساتھ بڑے بڑے بالوں والا ایک چھوکرا بھی تھا۔ وہ دونوں میری صدا سُن کر رک گئے اور میرے پاس آئے۔ عورت نے کہا۔" شاہ جی! مجھے ایک تعویذ دیدو تاکہ جلد سے جلد اُس بوڑھے خرانٹ سے نجات مِل جائے"۔

میں اُس کا مطلب نہیں سمجھا تو اُس نے وضاحت کی ۔۔ "میں اپنے شوہر سے طلاق چاہتی ہوں۔ وہ بڑا بدمعاش آدمی ہے"۔۔۔

میں نے ایک تعویذ اُس کے حوالے کر دیا۔ اُس نے اسے حفاظت سے پرس میں رکھا

اور مسکراتی ہوئی بولی —— "طلاق کے بعد میں اپنے اس دوست سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

لڑکا بھی اُس کی بات پر خوشی سے مسکرایا۔ پھر اُس نے پرس سے دو روپے نکال کر مجھے دیے اور بولی —— "فی الحال یہ رکھو شاہ جی۔ مُراد پوری ہو جانے پر میں تمھیں خوش کر دوں گی" —— پرس بند کرنے کے بعد اُس نے اپنے نوجوان دوست کا ہاتھ پکڑا اور مٹکتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئی۔"

"تو اُس حاتم کی بچی نے تجھے آیندہ کے وعدے پر ٹرخا دیا" ——

"ہاں! میں سمجھا تھا کہ آج موٹی اسامی پھنسی ہے۔ وارے نیارے ہو جائیں گے مگر۔"

بولتے بولتے دوسرا آدمی کچھ دیر کو رُکا — "مگر یار! چاہے جو بھی ہو۔ چیز بڑی زبردست تھی۔"

"تو تجھے کیا؟" ——

"مجھے اُس لونڈے پر رشک آرہا ہے۔ عیش کر رہا ہوگا بیٹا" ——

کچھ دیر کو دونوں خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا آدمی خیالوں کی دنیا سے واپس آتے ہوئے پھر بولا۔

"واہ واہ کیا چیز تھی۔ طبیعت خوش ہو گئی" ——

تیسرے آدمی نے جوان دونوں کی گفتگو بہت غور سے سُن رہا تھا اور اب تک خاموش تھا' ایک بار پھر ان کے چہروں کی طرف نظر کی اور حیرت سے بولا۔ "لیکن تم لوگ دیکھتے کیسے ہو؟ تمھاری تو آنکھیں نہیں ہیں۔"

"کیا کہا؟ — ہماری آنکھیں نہیں ہیں؟" پہلے اور دوسرے آدمی نے بیک وقت چیخنے کے سے انداز میں کہا — "اور تم بڑے آنکھوں والے ہو؟" ——

پھر دونوں ہلکورے لے لے کر زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔

تب وہ تیسرا آدمی جو اپنے چہرے پر دو بڑی بڑی روشن آنکھیں سجائے ہوئے تھا۔ اندھے قہقہے میں شرابور' خجل خجل سا ہوٹل سے نکلا اور بھیڑ میں منھ چھپا کر کہیں غائب ہو گیا۔

افواہیں اور سرگوشیاں

تعزیرات کے سارے الفاظ موٹی موٹی جلدوں کے درمیان منھ چھپائے سو رہے ہیں۔ گلیوں اور بازاروں میں ہُو کا عالم ہے۔ صرف اکّا دکّا آدمی اسپتال یا تھانے کو جاتا یا وہاں سے آتا دکھائی دیتا ہے گاہے گاہے گھروں سے بچّوں کے رونے کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اگر کوئی کان لگا کر سننے کی کوشش کرے تو مکّھیوں کی بھنبھناہٹ کی مانند کچھ انسانی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔

پہلی سرگوشی ــــــ

"ڈولی کے اسکول میں کسی نے ٹیلی فون کیا تھا کہ دو لاکھ روپے اسکول کے گیٹ پر رکھ دو ورنہ ہم تمھاری طالبات اور مِسوں کو اغوا کر لیں گے ــــ اور ٹھیک چار بجے انھوں نے پانچ لڑکیوں اور ایک مس کو اغوا کر لیا۔"

"جب ٹیلی فون آیا تھا تو ہیڈ مس نے اس کی اطلاع حکام کو کیوں نہیں دی؟"

"دی تھی لیکن انھوں نے سمجھا کہ یہ کسی لڑکے کی شرارت ہے یا کسی ایسے شخص نے غصّے میں دھمکی دی ہے جس کی بچّی کو داخلہ نہیں ملا۔"

دوسری سرگوشی ــــــ

"ڈاکوؤں نے بینک کے کیشئر اور چوکیدار کو گولی مار کر چھے لاکھ روپے لوٹ لئے۔"

"یہ تو کل کی بات ہے۔"

"کل کی نہیں آج کی ہے۔ کل تو مینیجر کو گولی ماری گئی تھی اور سات لاکھ روپے لوٹے گئے تھے۔"

"مگر آج کسی اخبار میں یہ خبر نہیں چھپی۔"

"اس خیال کے تحت کہ اس سے لوگوں میں خوف وہراس پھیلے گا۔ اس خبر کو بلیک آؤٹ کر دیا گیا ہے۔"

تیسری سرگوشی ــــــ

"چند مسلح افراد نے بائی وے پر ایک کار کے مالک کو زخمی کر کے کار چھین لی۔"

"کیا وہ کار چھین کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے؟"

"کامیاب نہ ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔"

چوتھی سرگوشی ــــــ

"کل برابر والے مکان کے لوگ ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ ہاتھوں میں پستول لئے کچھ لوگ گھر میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے اُن کے شیر خوار بچے کو اٹھانے کے بعد دھمکی دی کہ چابیاں فوراً انھیں دے دی جائیں ورنہ وہ بچے کو ہلاک کر دیں گے۔"

"پھر انھوں نے کیا کیا؟"

"کیا کرتے، انھیں اپنا بچہ عزیز تھا۔ سو انھوں نے خاموشی سے تمام چابیاں ان کے حوالے کر دیں۔ اور وہ نقدی اور زیورات لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔"

پھر ایک اور سرگوشی ــــــ

ایک اور ــــــ

ایک اور ــــــ

ایک دن یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ بہت سے افراد کی ایک جماعت نے جو رائفلوں اور اسٹین گنوں سے مسلح تھی، ایک کالونی کا محاصرہ کر لیا۔ انھوں نے کالونی کے کئی جوانوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کرنے کے بعد لڑکیوں اور جوان عورتوں کی آبرو ریزی کی اور مال اسباب ٹرکوں میں بھر کر راتوں رات فرار ہو گئے۔

جب وہ ٹرکوں پر سوار ہو رہے تھے تو کالونی کے کسی باشندے نے موقع پا کر گولی چلا دی جس سے ایک وردی پوش ٹرک سے نیچے گر کر ڈھیر ہو گیا۔ لیکن یہ خبر نہ تو اخباروں میں چھپی، نہ ریڈیو یا ٹیلی ویژن

سے نشر ہوئی۔ اس کا علم تو لوگوں کو اس وقت ہوا جب کئی دنوں کے بعد وردی والے محکمے نے ایک پریس ریلیز کے ذریعے اس افواہ کی تردید شائع کرائی کہ کالونی کی واردات میں اس محکمے کا ایک پورا دستہ ملوث تھا۔

پریس ریلیز کا کوئی اثر نہ ہوا تو محکمے کے سب سے بڑے افسر نے ایک پریس کانفرنس میں اس افواہ کی پُر زور تردید کی۔ اس پریس کانفرنس کی روداد ملک کے تمام اخباروں میں نمایاں طور پر شائع کرائی گئی۔ ریڈیو اور ٹی وی بھی کئی دن تک اسے نشر کرتے رہے۔ لیکن لوگوں کو پھر بھی اس پر یقین نہیں آیا۔

وہ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے اب بھی یہی کہتے پھرتے ہیں کہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کرنے والا گروہ باقاعدہ تربیت یافتہ ہے اور یہ وردی والے محکمے سے تعلق رکھتا ہے۔

عجیب لوگ ہیں ـــــ کسی بات پر یقین ہی نہیں کرتے ـــــ سوائے افواہوں اور سرگوشیوں کے ـــــ

تنکا

تاریکی کا جال ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا کہ وہ اپنی بیوی کے کھانسنے کی آواز سُن کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کی بیوی نے کھانستے کھانستے نڈھال ہو کر پہلو بدلا اور پھر اپنے بچے کو سینے سے لگا کر سو گئی۔ وہ خاموشی سے اپنی بیوی اور بچے کو دیکھتا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وقت کا صحیح اندازہ بھی وہ نہیں کر پا رہا تھا۔ آخر کار سرہانے کی طرف ہاتھ بڑھا کر اُس نے ایک بیڑی نکالی اور اسے اچھی طرح سُلگا کر تیز تیز کش لینے لگا۔ خالی ذہن کے ساتھ وہ اسی طرح کش پر کش لیتا رہا ــــــ بیوی نے پھر کروٹ بدلی۔

"لالے کی ماں سو رہی ہے کیا؟" ــــــ اُس نے پھٹی پھٹی آواز میں سوال کیا۔

"نہیں تو" ــــــ بیوی نے نیند سے بوجھل لہجے میں جواب دیا۔

"کیا وقت ہوا ہو گا؟" ــــــ

"پتہ نہیں ــــــ لیکن فجر کی اذان اب ہونے ہی والی ہے" ــــــ

وہ خاموش ہو گیا ــــــ پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔

"لالے کی طبیعت کیسی ہے؟" ــــــ

"بخار تیز ہو گیا ہے ــــــ رات بھر سونے نہیں دیا" ــــــ

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے ایک طویل کش لے کر بیڑی کے ٹکڑے کو پھینکا اور اُٹھ کر باہر چلا گیا ــــــ چند منٹوں میں مُنھ ہاتھ دھو کر پھر کمرے میں واپس آیا اور

بیوی کے سرہانے مجرموں کی طرح کھڑا ہو گیا۔

"اللہ اکبر۔ اللہ اکبر" اذان کی آواز سن کر اُس کی بیوی اُٹھ بیٹھی اور دوپٹے کا ایک سرا اپنے سر پر رکھ لیا۔

"اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ لاالٰہ الااللہ"

مؤذن کی پکار ختم ہوئی تو اُس کی بیوی نے پوچھا۔

"باہر کہاں گئے تھے؟" ——

"منھ ہاتھ دھونے" —— اُس نے آہستہ سے کہا اور پھر ذرا رُک کر بڑی ہمت کر کے دریافت کیا ——

"کچھ کھانے کو ہو گا؟" ——

"نہیں —— رات کی ایک روٹی بچی تھی لیکن لالے ضد کرنے لگا تو میں نے اُسے کھلا دی"۔ وہ کچھ بولا نہیں۔ چُپ چاپ اپنی لال قمیص اٹھائی اور باہر جانے لگا —— بیوی نے اُسے جاتے دیکھ کر کہا ——

"ڈیوٹی سے واپس آتے ہوئے لالے کی دوا ضرور لیتے آنا۔ بخار تیز ہو گیا ہے" ——

اُس نے دروازے پر ٹھٹھک کر بیوی کی ہدایت سُنی اور کوئی جواب دیئے بغیر تیز تیز قدم اُٹھاتا اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا ——

اسٹیشن پہنچ کر اُس نے ایک کپ چالو چائے پی اور کچھ دیر یوں ہی اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ ابھی کسی گاڑی کی آمد یا روانگی کا وقت نہیں ہوا تھا اس لیے ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ خالی پلیٹ فارم پر صرف ریلوے کے اِکّا دُکّا ملازمین اور صفائی کا عملہ آتا جاتا نظر آرہا تھا۔ وہ بھی یوں ہی ٹہلتا رہا۔ ٹہلتے ٹہلتے جب تھرڈ کلاس بکنگ کاؤنٹر کے قریب پہنچا تو اُس کی ملاقات ریلوے کے ایک بابو سے ہو گئی۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر بابو کو سلام کیا تو اُس نے سلام کا جواب دینے کی بجائے مُسکراتے ہوئے کہا ——

"کہاں مٹر گشتی کر رہے ہو۔ ٹرین آنے میں ابھی بہت دیر ہے"——

"اور کتنی دیر؟"——

"شاید ایک گھنٹے سے زیادہ"—— بابو نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا——

وہ اسٹیشن کے باہر آگیا۔ باہر سڑک پر ٹریفک کی آمدورفت شروع ہوگئی تھی۔ سڑک کے کنارے ایک طرف اُس کے کچھ ہم پیشہ تاش کی محفل جمائے بیٹھے تھے۔ وہ بھی ان کے پاس جاکر بیٹھ گیا اور تاش کا کھیل دیکھنے لگا۔ جب ایک بازی ختم ہوئی اور پتے پھر سے تقسیم کیے جانے لگے تو اس کے ایک ساتھی نے بلند آواز میں کہا——

"کیوں یار! آج بڑا چُپ چاپ بیٹھا ہے"——

"منہ تو ایسے لٹکائے ہوئے ہے جیسے جورو مرگئی ہو سالے کی"—— دوسرے نے گرہ لگائی۔

ایک قہقہہ بلند ہوا اور پھر وہ سب تاش کے پتوں میں گُم ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر وہاں سے اُٹھ کر تھرڈ کلاس بکنگ کاؤنٹر کی طرف سے ہوتا ہوا انکوائری کاؤنٹر پر پہنچا جہاں ایک بابو اونچی کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے مرغولے بنا رہا تھا۔ اُس نے کاؤنٹر کی کھڑکی پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

"اب گاڑی آنے میں کتنی دیر ہے بابو؟"——

"گاڑی؟ کون سی گاڑی؟"—— بابو نے چونکتے ہوئے اُلٹا اُسی سے سوال کر دیا——

"وہی صبح والی ڈاؤن ایکسپریس"——

"آج کوئی گاڑی نہیں آئے گی۔ سیلاب کی وجہ سے تمام لائنیں خراب پڑی ہیں سمجھے؟"——

اُس کا سر جیسے گھومنے لگا——

کچھ ہی دیر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ تمام ٹرینوں کی آمدورفت معطل کر دی گئی ہے۔ جانے والے مسافر اور آنے والوں کے منتظر عزیز رشتہ دار آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے۔ قلیوں، ہاکروں اور خوانچے والوں میں کہرام مچ گیا۔

دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم ایک بار پھر سُنسان ہوگیا——

بارہ بجکر سترہ منٹ پر ایک لوکل ٹرین پلیٹ فارم نمبر تین پر آ کر لگی۔ تمام قلی، خوانچہ فروش اور ہاکر جو اس سے پہلے بولائے بولائے پھر رہے تھے۔ تین نمبر پلیٹ فارم کی طرف دوڑ پڑے۔ مگر لوکل ٹرین کے مسافر، مسافر کہاں ہوتے ہیں کہ اُن سے کوئی اُمید وابستہ کی جائے۔ وہ کود کود کر ٹرین سے اُترتے اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اپنی راہ لیتے۔ نہ کوئی قلی کو آواز دیتا اور نہ خوانچے والوں اور ہاکروں سے رجوع کرتا۔

وہ ہر کمپارٹمنٹ میں جھانکتا ہوا پلیٹ فارم کے بالکل آخری سرے پر پہنچ گیا جہاں ایک مسافر ہولڈال اور کچھ دوسرے سامان لیئے کھڑا تھا۔ اُس نے بڑی اُمید کے ساتھ اس مسافر سے دریافت کیا ___

"کہاں جاؤ گے بابو؟" ___

"جاؤں گا کہاں؟ پورے پنجاب اور سندھ میں سیلاب آگیا ہے اور اب پانی کراچی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میرا گھر چونکہ نشیبی علاقے میں ہے اس لیئے چند دنوں کے لیئے ایک دوست کے ہاں منتقل ہو رہا ہوں" ___

"تو باہر تو جاؤ گے نا؟" ___

"ہاں! باہر تو جانا ہی ہوگا۔ تم یہ سامان اُٹھا کر کسی رکشا میں رکھ دو۔ میرے دوست کا گھر یہاں سے قریب ہی ہے" ___

"دو روپے ہوں گے صاب" ___ اُس نے ہولڈال اپنے سر پر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"دو روپے؟ تمھارا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟ ___ آٹھ آنے سے زیادہ بالکل نہیں دوں گا" ___

وہ ذرا دیر کو رُکا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "جو مناسب ہو دیدینا صاب جی" ___

رکشا پر بیٹھ کر اُس شخص نے پچاس پیسے کا ایک سکہ اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ پیسے لیکر وہ مڑا ہی تھا کہ اُس کے ایک پرانے ساتھی نے اُس کے شانے پر دھول جماتے ہوئے کہا ___ "ارے

واہ رے میرے شیر! تیرا دھندا تو آج بھی خوب چل رہا ہے۔ اپنی تو بہنی بھی نہیں ہوئی ——
چل چائے پلا"——

وہ بہت انکار کرتا رہا کہ آج نہیں کل تجھے چائے پلا دوں گا۔ لیکن اُس نے ایک نہ سُنی
اور اُسے گھسیٹتا ہوا لے کر چائے والے تک پہنچ گیا——

چائے پی کر اُس نے چائے والے کو پچاس پیسے کا سکہ دیا اور دس دس پیسے کے دو سکے
اس سے واپس لے کر اپنی جیب میں رکھے اور پھر اُسی طرح اِدھر اُدھر منڈلانے لگا—— یہاں تک کہ
شام ہوگئی۔ اس اثنا میں لوکل ٹرینیں تو کئی آئیں۔ لیکن اس کے حصے میں ایک بھی سواری نہ آئی ——

اندھیرے اور اُجالے کی ایک طویل کشمکش کے بعد جب اُجالا بالکل پسپا ہوگیا اور اندھیرا
غالب آنے لگا تو وہ بھاری دِل اور بھاری قدموں کے ساتھ اسٹیشن سے باہر نکلا——

"ڈیوٹی سے واپس آتے ہوئے لالے کی دوا ضرور لیتے آنا۔ بخار تیز ہوگیا ہے"——
بیوی کی ہدایت اُسے مستقل کچوکے لگا رہی تھی۔ قدم قدم پر چوٹ کھاتا وہ اسی طرح چلتا
رہا—— چلتے چلتے اُس کے قدم ایک امدادی کیمپ کے سامنے رُک گئے۔ بہت دیر تک وہ وہیں
کھڑا کچھ سوچتا اور پیچ و تاب کھاتا رہا۔ جب کافی وقت گزر گیا اور اندھیرا پوری طرح غالب آگیا
تو وہ سر جھکا کر کیمپ کے اندر داخل ہوگیا——

"کیا ہے؟"—— کیمپ کا ایک کارکن اُس سے مخاطب ہوا——

"جی —— امداد"——

کوئی چیز اُس کے اندر چٹخ کر ٹوٹ گئی اور وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔

"نام کیا ہے؟"——

"جی دریا خان"——

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"——

"جی —— سرحد کا"——

"سرحد ؟ ـــ لیکن سرحد میں تو سیلاب نہیں آیا" ـــ کارکن نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ـــ

لیکن صاب جی ـــ میں رہتا تو یہیں کراچی میں ہوں نا" ـــ

اُس نے اپنی دانست میں وضاحت کی۔

"ارے بابا تو یہاں کون سا طوفان آگیا ہے" ـــ کارکن نے ہنستے ہوئے کہا ـــ

وہاں کھڑے ہوئے دوسرے لوگ بھی اُس کے ساتھ ہنسنے لگے ـــ

لیکن گاڑی ......" وہ کارکن کو سمجھانا چاہتا تھا مگر اُس نے اُس کی بات کو اَن سُنی کرتے ہوئے دھکا دے کر اُسے باہر نکال دیا ـــ

"جاؤ بابا جاؤ ـ خواہ مخواہ وقت نہ خراب کرو" ـــ

امدادی کیمپ کے کارکن کے کہنے کے مطابق کراچی میں طوفان تو نہیں آیا تھا۔ لیکن جب وہ کیمپ سے نکل کر لڑکھڑاتا ہوا سڑک پر آیا تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ چاروں طرف سے طوفانِ نوح میں گھر گیا ہے ـــ

نادیدہ افق

وہ بڑا انتہا پسند قسم کا نوجوان تھا۔ انتہا پسند اور اپنی بات سے نہ پھرنے والا۔ اس کے اپنے کچھ اُصول تھے اور وہ ان اصولوں پر بڑی سختی سے عمل کرتا تھا۔

"قسمت وسمت کچھ نہیں۔ یہ محض بکواس ہے۔ انسان کو اپنی صلاحیت اور محنت پر بھروسا کرنا چاہیئے۔ احساسِ کمتری نسب کی خرابی کا دوسرا نام ہے۔ سمجھے؟" وہ بڑی صفائی اور بے باکی سے کہا کرتا۔

اور یہ ایک حقیقت تھی کہ غریب اور معمولی پڑھے لکھے والدین کی اولاد ہونے کے باوجود اس نے کبھی قسمت پر تکیہ نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی صلاحیت اور محنت کو اپنی کامیابی کا سبب قرار دیتا۔ کسی قسم کی کمتری کا احساس اُسے چھو بھی نہیں گیا تھا۔ لیکن اُسے کیا معلوم کہ حقیقت صرف وہی نہیں ہے جسے وہ کتابوں میں پڑھتا آیا ہے بلکہ وہ بھی ہے جو اس سرزمین کے اوپر انسان اپنے عمل کے ذریعہ لکھتا ہے اور پھر یہی تحریر لاکھوں، کروڑوں انسانوں کا مقدر بن جاتی ہے۔

وہ اپنی طالب علمی کے زمانے سے سُنتا آیا تھا کہ بغیر سفارش کے ملازمت حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ مشکل مگر اس نے کبھی ان باتوں پر یقین نہیں کیا تھا۔ وہ اسے محض نااہل امیدواروں کا ایک سستا اور مقبول بہانہ قرار دیتا۔ یہاں تک کہ بی۔ اے پاس کر لینے کے بعد جب وہ پہلی بار انٹرویو میں ناکام ہوا تو بھی اُس نے اس مقبول نسخے سے فائدہ نہیں اُٹھایا اور اپنی ناکامی کی وجہ یہ بتائی کہ اس نے انٹرویو میں پوچھے گئے تمام سوالوں کے جواب بالکل صحیح نہیں دیئے تھے۔

"تو کیا دوسرے امیدواروں نے تمام سوالوں کے سو فی صد صحیح جواب دیئے تھے ؟" اُس کے ایک قریبی دوست نے اس سے سوال کیا تھا۔

"عین ممکن ہے کہ انھوں نے ایسا ہی کیا ہو" ــــ اس نے بڑی سختی کے ساتھ جواب دیا۔ اُس کا دوست خاموش ہوگیا تھا۔

جب دوسرے انٹرویو میں بھی اُسے نہیں لیا گیا تو اُس کے دوست نے بڑے طنزیہ انداز میں اُس سے پوچھا تھا۔

"بتاؤ اس بار کیا وجہ ہوئی ؟"

"وجہ میں نہیں جانتا۔ ہوسکتا ہے کہ مجھ سے بہتر اور اہل اُمیدوار موجود ہوں جنھیں منتخب کیا گیا ہو۔" اُس نے پھر اپنی منطق سے کام لیا۔

"وجہ ہر کوئی جانتا ہے میرے دوست ــــ شاید تم بھی لیکن تم اپنے فلسفیانہ ذہن اور کتابی علم سے مجبور ہو۔ کچھ دنوں میں ساری باتیں خود بخود سمجھ میں آنے لگیں گی" ــــ اس کے دوست نے رائے دی۔ دونوں کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مصنوعی اور پھیکی مُسکراہٹ رینگ گئی۔ اس طرح یکے بعد دیگرے اُس نے کئی اور انٹرویو دے ڈالے مگر کامیابی کا چہرا کہیں بھی نظر نہ آیا۔ پھر وہ اپنے معیار سے زینہ بہ زینہ نیچے اُترنے لگا تاکہ کہیں کسی جگہ اپنے پاؤں جما سکے۔ ایک بار تو وہ بیک جست کئی زینے نیچے آ گیا تھا ــــ انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بورڈ کے چیئرمین نے اس سے سوال کیا ــــ

"مسٹر جاوید! ــ آپ بی۔ اے پاس ہیں ؟"

"جی! ــ"

"لیکن جس عہدے کے لئے آپ انٹرویو دینے آئے ہیں اس کے لئے صرف میٹرک پاس لوگوں کی ضرورت ہے۔ اس طرح آپ اس پوسٹ کے لئے اُوورکوالیفائڈ

ہیں۔ آپ ہی سوچیئے اگر میں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے پاس لوگوں کو ان اسامیوں پر لے لیا تو یہ بیچارے میٹرک پاس لوگ کہاں جائیں گے؟ ـــــ میرے خیال میں آپ کو کسی بہتر اور کوالیفیکیشن کے اعتبار سے مناسب عہدے کے لئے اپلائی کرنا چاہیئے۔"

کمرے سے باہر آنے کے بہت دیر بعد تک یہ تلخ آواز اس کے کانوں میں زہری بان کی طرح چبھتی رہی۔ پھر جب اس نے ان الفاظ کی معنویت پر غور کرنا شروع کیا تو اُسے یہ معقولیت سے پُر نظر آئے۔ زہری بان کی شدت میں کمی محسوس ہونے لگی اور مایوسی کی بجائے اُسے اس آگہی کے احساس سے ایک طرح کی خوشی ہوئی۔ بہت سارے نادیدہ اُفق اس کی آنکھوں کے سامنے جھلملانے لگے۔ لیکن یہ آگہی کا احساس اور نادیدہ اُفق کی جھلملاہٹ اُس کے گھر کے اندھیرے کو دُور نہیں کر سکتی تھی۔ دوست، یار اور پاس پڑوس کے لوگ ملازمت کے سلسلے میں اُس سے طرح طرح کے سوالات کرتے۔ جب وہ نہایت ہی ضبط کے ساتھ کوئی مختصر سا جواب دیتا تو لوگ اسے اس کے غرور اور دماغ کی خرابی پر محمول کرتے۔ کوئی کہتا" رسی جل گئی پر بَل نہیں گیا"۔ کوئی اپنا فیصلہ سُناتا" اے بچو! بغیر سفارش کے آج کل کیسے نوکری ملتی ہے جو تمھیں مل جائے گی؟"

آس اور یاس کے سمندر میں ہچکولے کھاتے کھاتے ایک بار پھر اس نے اپنی سطح سے اوپر اُٹھنے کی کوشش کی ـــ شاید وہ بلندی ہی اُس کا اصل مقام ہو ـــ لیکن جیسے ہی وہ اُس اونچے مقام پر پہنچنے والا تھا کہ ایک زوردار تھپیڑے نے اُسے پھر نیچے گرا دیا۔

"میاں جب تمھارے پاس کوئی سفارش نہیں تو پھر انٹرویو دینے کیوں چلے آئے۔ وہ بھی اس اونچے عہدے کے لئے۔ یہاں تو تقرر پہلے ہی ہو چکا ہے اور یہ انٹرویو محض ایک دکھاوا اور ڈھونگ ہے۔ یوں سمجھو کہ اس طرح ناجائز کو جائز بنایا جا رہا ہے۔"

اُس کے اعتماد کا بیڑا ڈگمگانے لگا۔

ایسے میں ایک پڑوسی نے اپنے کسی عزیز کے ذریعہ ایک سیاسی رہنما سے سفارشی خط

حاصل کر کے اُسے سہارا دیا۔ یہ سفارشی خط اس کی خود اعتمادی اور غیرت کے لئے ایک چیلنج تھا۔ وہ اسے ہرگز قبول نہ کرتا لیکن جب اس کے بوڑھے باپ نے رقت بھری آواز میں اس سے اسے قبول کر لینے کی درخواست کی تو وہ انکار نہ کر سکا۔ پڑوسی نے اس کے والد کو بتایا تھا کہ یہ خط اس سیاسی رہنما نے اپنے خاص قلم سے لکھا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ انٹرویو میں اسے نہ لیا جائے۔ لہٰذا وہ اس خط کو لے کر انٹرویو میں شریک ہوا۔ انٹرویو ختم ہونے کے بعد جب سارے اُمیدوار جا چکے تو وہ بورڈ کے چیئرمین سے ملا اور خط اُس کے حوالے کر دیا۔ چیئرمین نے بہت توجہ کے ساتھ خط کو پڑھا اور پھر اُس سے مخاطب ہوا ——— "مجھے افسوس ہے کہ" کہ اب میں اس عہدے پر آپ کو نہ لے سکوں گا باوجود اس کے کہ آپ کا سلیکشن بورڈ کے ذریعہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں نے آج تک کسی سفارش یا دباؤ کے تحت کوئی کام نہیں کیا۔ آپ جائیے۔ میں کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔" اس کا لہجہ بہت سخت مگر متوازن تھا۔

ملازمت ملنے کے امکان ختم ہو جانے پر پہلے تو اُسے مایوسی ہوئی ——— پھر آہستہ آہستہ مایوسی کا احساس زائل ہونے لگا۔ خود اعتمادی کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے بہت سارے تاریک گوشے اُس کی آنکھوں کے سامنے منور ہو گئے ہوں۔ تہہ در تہہ فریب کا پردہ چاک کر کے اُس نے سچائی کا جلوہ دیکھ لیا ہو۔ گھر واپس آ کر اُس نے نتیجے کے منتظر اعزہ اور دوسرے لوگوں سے کہا ———

"قسمت وسمت کچھ نہیں ——— یہ محض بکواس ہے۔ انسان کو اپنی صلاحیت اور محنت پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ سفارش کے ذریعہ کسے نوکری ملی ہے جو مجھے ملتی ......"

ٹھنڈا سورج

یہ شہر ہے ہی بڑا بدقسمت۔ ہمیشہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے کسی نہ کسی آفت کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ عام انتخابات کو کچھ ہی دن باقی تھے کہ پورا شہر وبا کی لپیٹ میں آ گیا۔ میونسپلٹی کی طرف سے میرے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا کہ میں گھر گھر جا کر صفائی کراؤں اور ہر علاقے میں دوائیاں تقسیم کروں۔ سارا سارا دن میں شہر کے مختلف علاقوں ہی میں گھومتا رہتا۔ گھروں میں جاتا۔ صفائی کرواتا۔ اور پھر مختلف ممالک اور بین الاقوامی اداروں کی طرف سے امداد میں آئے ہوئے پاؤڈر اور دوائیں لوگوں میں تقسیم کر کے انھیں اس کا طریقۂ استعمال سمجھاتا۔ ان میں سے بیشتر دوائیں ایسی تھیں، جن کا استعمال احتیاطی تدبیر کے طور پر وبا کے پھوٹنے سے قبل کیا جاتا ہے۔ مگر میں یہ دوائیں اس وقت تقسیم کر رہا تھا، جب کہ پورا شہر وبا کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ میونسپلٹی کے چیئرمین کا حکم ہی یہی تھا۔ اور میں ایک اچھے ملازم کی طرح اپنے حاکم کا حکم بجا لا رہا تھا۔ یوں دیکھا جائے تو یہ کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں۔ کیونکہ ہمارے ملک میں ہر کام وقت گذر جانے کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کا قومی دستور ہے، جسے کوئی رد نہیں کر سکتا۔

اس بار ایسے وقت میں وبا پھیلی تھی، جب کہ ملک کے عام انتخابات بہت قریب تھے۔ ایسی حالت میں میرے اور دیگر کارکنوں کے لئے ضروری تھا کہ اپنا کام پوری مستعدی سے انجام دیں۔ ورنہ ہو سکتا تھا کہ کوئی جماعت اُسے بھی الیکشن ایشوع بنا لیتی اور ہماری جانوں کے لالے پڑ جاتے!

چیئرمین کی ہدایت ملتے ہی میں اپنے ساتھیوں کو لے کر سب سے پہلے اعظم نگر پہنچا۔ یہ شہر کے

بڑے تاجروں، صنعت کاروں اور افسروں کا رہائشی علاقہ ہے۔ جس گھر میں جاتا، موضوع گفتگو الیکشن ہوتا۔ ہر جگہ لوگ سیاسی پارٹیوں اور لیڈروں پر رائے زنی کر رہے ہوتے۔ ان کی گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یہ لوگ الیکشن سے کچھ خوش نہیں۔ ویسے وہ بعض جماعتوں اور رہنماؤں کو سراہتے ضرور تھے۔ لیکن ان کی طرف سے بھی انہیں زیادہ اطمینان نہ محسوس ہوتا تھا۔

روڈ نمبر ۵ کی ایک عمارت میں گیا۔ ڈرائنگ روم میں کچھ لوگ صوفوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک قد آدم لیمپ رکھا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں ٹیلی ویژن کے چھوٹے بڑے دو سیٹ لگے تھے تیسرے کونے میں ایک بڑا سا بک شیلف تھا جس میں رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا تھا کہ یہ صرف آرائش کے لئے رکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں کو ایک مدت سے ہاتھوں کا لمس میسر نہیں آیا تھا۔ اور نہ ان پر پلکوں کے سائے ہی پڑے تھے۔ کبھی کتابیں انسان کی آرائش کرتی تھیں۔ اب انسان کتابوں کی آرائش کرنے لگا ہے۔ انکم ٹیکس کا زمانہ جو ٹھہرا۔!

میں نے سنا، گھر کا مالک کہہ رہا تھا۔ "میری جوٹ مل تو اب تک پروڈکشن میں چلی گئی ہوتی۔ لیکن میں نے اس کا کنسٹرکشن الیکشن تک روک دیا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو۔"

"ہاں بھئی! آج کل جس کو دیکھو وہی صنعتوں کو قومیانے کی بات کرنے لگا ہے۔ ایسے میں کوئی رسک لینا ٹھیک نہیں۔" سگریٹ کو لائٹر کا شعلہ دکھاتے ہوئے دوسرے صاحب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

سی بلاک میں آبنوسی چہرے والا ایک موٹا آدمی بولا۔ "نہ جانے ان سیاسی لیڈروں کو کیا ہو گیا ہے۔ سب سالے کاروباریوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔" پھر بہ یک وقت ناک اور منہ سے سانس لینے کے بعد اس نے ایک لیڈر کا نام لے کر اسے موٹی سی گالی دی۔ "یہ کمبخت جیت گیا تو اپنی کا بیڑا ہی غرق کر دے گا۔ بولتا ہے، ہمارا پارٹی پاور میں آ گیا تو ہم ہر جگہ سے ایجنٹ اور مڈل مین کا خاتمہ کر دے گا حرام زادہ!"

سی بلاک سے اپنا کام نمٹا کر بڑی شاہراہ کی ایک بلڈنگ میں داخل ہوا۔ وہاں بھی یہی

موضوع تھا۔ ایک آدمی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: کیا کرے گا، بھائی! ہم کو تو ہر پارٹی کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔ سب کو برابر برابر چندہ دیتا ہے۔ تاکہ کوئی بھی پاور میں آئے تو کاروبار کو کوئی نقصان نہ ہو۔"

چند دنوں میں اعظم نگر کا کام مکمل ہو گیا تو مجھے اپنے ماتحتوں کو لے کر نئی کالونی کے علاقے میں جانا پڑا۔ اس کالونی میں دو دو تین تین کمروں کے چھوٹے چھوٹے مکانات ہیں۔ یہاں کی آبادی صحافیوں، کلرکوں، دکان داروں، معلموں اور اسی طرح کے دوسرے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کے لوگ زور زور سے اخبار پڑھتے اور گرم گرم لہجے میں باتیں کرتے نظر آئے۔ ان میں ہر شخص کسی نہ کسی پارٹی اور کسی نہ کسی لیڈر کو پسند کرتا تھا اور جسے وہ پسند کرتا تھا، اس کی ہر بات کی حمایت اور دوسروں کی مخالفت کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔

"دیکھو کیسا زوردار بیان دیا ہے۔!"

"ارے میاں زوردار بیان سے کیا ہوتا ہے، کام زوردار ہونا چاہیئے۔"

"اس بار ہماری پارٹی اقتدار میں آگئی تو سارے مسائل حل کر دے گی۔"

"تمہاری پارٹی اقتدار میں آ ہی نہیں سکتی۔"

"عوام ہمارے ساتھ ہیں ۔۔۔!"

"عوام ہمارے ساتھ ہیں ۔۔۔!"

سب سے آخر میں سڑکوں کے کنارے آباد علاقوں کی طرف گیا۔ حالانکہ مجھے سب سے پہلے اسی طرف جانا چاہیئے تھا، کیونکہ وبا کی ابتدا ان ہی علاقوں سے ہوئی تھی۔ اور ان بستیوں کے کئی افراد اب تک ہلاک بھی ہو چکے تھے۔ لیکن چیئرمین کا حکم تھا کہ سب سے پہلے اعظم نگر کی طرف توجہ کروں۔ اور سب سے آخر میں ان بستیوں کی طرف جنہیں میونسپلٹی نے کوئی نام دینے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی تھی ۔۔۔ سو میں نے ایک فرماں بردار کارندے کی طرح ایسا ہی کیا۔ ان علاقوں میں رکشا چلانے والے، پھیری کرنے والے اور مزدور طبقے کے لوگ آباد ہیں۔ زیادہ تعداد ملوں

اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کی ہے۔ جنہیں ان دنوں اپنے مالک کی ہدایت پر سیاسی لیڈروں کی تقریر سُننے کے لئے جانا پڑتا تھا۔ تمام لیڈر مزدوروں سے اپنی ہمدردی کا اظہار کرتے، انہیں اپنا بھائی گردانتے اور ان کی حالت بہتر بنانے کا یقین دلاتے۔

"ہم سب سے پہلے اپنے مزدور بھائیوں کی حالت بہتر بنائیں گے ۔!"

"مزدوروں کی اُجرت میں اضافہ کیا جائیگا۔"

"انھیں رہنے کے لئے مکان دیئے جائیں گے اور مفت علاج کا انتظام ہوگا۔"

مزدوروں کے چہرے پر خوشیوں کا سورج دمکنے لگتا۔ وہ سوچتے اس بار ان کے سارے دُکھ درد دُور ہو جائیں گے ......

"کچھ روج اور ٹھہر جاؤ کھان صاحب، پھر سب کرجا اتار دے گا ۔!"

"کچ روز اور ـــ کچ روز اور ـــ اَم کتنا دن انتظار کرے گا؟"

"کچھ روج اور کھان صاب ..... بس جرا بھوٹ ہو جائے اس کے بعد سب روپیہ دے دیگا۔ سود مول سب ۔!"

اس کے بعد ہمارا کام مکمل ہو گیا تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ رفتہ رفتہ وبا کا زور بھی ختم ہو گیا۔

لیکن یہ شہر تو ہے ہی بدقسمت!

عام انتخابات کے کچھ عرصے بعد پورا شہر ایک بار پھر وبا کی لپیٹ میں آگیا۔ دن رات کی محنت شروع ہو گئی سب سے پہلے اعظم نگر گیا۔ وہاں سے نئی کالونی اور پھر سب سے آخر میں سڑکوں کے کنارے آباد بستیوں میں ـــ لیکن کہیں کسی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔ شہر کے تمام لوگ حسبِ معمول اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ کوئی ذرہ اپنی جگہ سے نہیں کھسکا تھا۔

ہر شئے اپنے محور پر گردش کر رہی تھی ۔!

اَندھا سفر

سو سچ صرف یہ ہے کہ مَیں جب اُس گولامبر کے پاس پہنچا جس کے چاروں طرف سے راستے نکلتے ہیں تو مجھے بھیڑ ہی بھیڑ نظر آئی۔ بھیڑ چہروں کی، رنگوں کی، آوازوں کی اور نہ جانے کِس کِس کی لیکن ان میں سے ایک بھی چہرا، ایک بھی رنگ، ایک بھی آواز میری پہچانی ہوئی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے میرے شناسا انہی راستوں میں سے کسی راستے پر آگے نکل گئے ہوں ـــــ یا پھر وہ بہت پیچھے رہ گئے ہوں اور اب تک یہاں نہ پہنچ پائے ہوں ـــــ مگر اس کا ذکر فضول ہے کیونکہ میں نے نہ تو آگے جانے والوں کو دیکھا تھا اور نہ بعد میں آنے والوں کو اب تک دیکھ سکا ہوں ـــــ اور جو آنکھوں کے سامنے ہے اس میں میرا کوئی نہیں ہے۔ سبھی اجنبی، سبھی ناآشنا ـــــ پھر بھی میں کسی اپنے کی تلاش شروع کرتا ہوں۔

یہ چہرا ـــــ وہ چہرا

یہ رنگ ـــــ وہ رنگ

یہ آواز ـــــ وہ آواز

کون سا چہرا میرا ہمدم ہے ـــــ گول یا کتابی یا.....

کون سا رنگ میرا دوست ہے ـــــ سیاہ یا سُرخ یا.....

کون سی آواز میری مونس ہے ـــــ اُونچی یا مدھم یا......

نہیں کوئی نہیں ـــــ اور بصارت اجنبیت کے پتھر سے ٹکرا ٹکرا کر چُور ہو رہی ہے۔

- جانے اب ایسا کیوں لگتا ہے؟

پہلے تو ایسا نہیں تھا۔

پہلے پہل تو میں نے جس چہرے کو دیکھا وہ مجھے اپنا سا معلوم ہوا۔
جو رنگ سامنے بکھرا وہ آنکھوں میں کھُب گیا۔
جو آواز کانوں کے پردے پر تھرتھرائی میری رفیق بن گئی ...

رفتہ رفتہ میں نے بہت سارے چہروں کو اپنا ہمدم بنا لیا۔ ڈھیر سے رنگ میرے ساتھی بن گئے۔ بے شمار آوازیں میری ہم ساز بن گئیں ــــ لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے ورنہ اس سے قبل تو میں تن تنہا ہی سفر پر نکل کھڑا ہوا تھا۔ کوئی بھی میرا ہم سفر نہ تھا ــــ نہ کوئی چہرا، نہ کوئی رنگ، نہ کوئی آواز۔

صرف ایک چہرا تھا، صرف ایک رنگ اور صرف ایک آواز ــــ اور وہ میں تھا۔
سنسان راستے کے تنہا سفر میں مَیں نے کتنی منزلیں طے کی تھیں اور کتنی منزلیں ابھی اور باقی تھیں یہ تو نہیں کہہ سکتا ــــ ہاں! اتنا یاد ہے کہ میں بہت دیر تک اور بہت دُور تک چلتا رہا تھا کہ میرے پاؤں دُکھنے لگے ــــ پھر شانے ــــ پھر سر ــــ یہاں تک کہ رینگنے کی سکت بھی مجھ سے جاتی رہی ... واپسی بھی میرے بس میں نہ تھی ــــ سو میں نے وہیں پر پڑاؤ ڈال دیا۔
تب کہیں سے ایک چہرا میری آنکھوں کے دائرے میں آگیا۔
پھر ایک رنگ میرے گرد لہرایا۔
پھر ایک آواز کانوں کے پردے پر تھرتھرائی۔

خوف اور حیرت کا لمحہ ٹوٹا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ سب بھی اپنے اپنے سفر میں تھے اور ان میں سے کسی کو نہ تو راستے کی جانکاری تھی اور نہ وہ منزل کو پہچانتے تھے۔

تب فیصلہ کیا گیا کہ ہم سب ساتھ ہی سفر پر روانہ ہوں گے۔ سب مل کر راستہ بنائیں گے اور منزل کی شناخت میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے کچھ اور چہرے کچھ اور رنگ کچھ اور آوازیں ہمارے ساتھ ہوتی گئیں۔
تھکن کا احساس مِٹنے لگا۔
راستے تیزی سے بننے اور طے ہونے لگے۔

ہم آگے بڑھتے رہے ۔ آگے ـــــ اور آگے ......

ہماری آخری منزل اور کتنی دوری پر تھی یہ تو بالکل صحیح طور پر نہیں معلوم لیکن ایسا لگتا تھا جیسے منزل اب قریب ہی ہے ـــــ کہ چہروں کی شناخت، رنگوں کی تمیز اور آوازوں کی رسائی ختم ہو گئی۔

اب بے شمار چہرے تھے ـــــ ایک دوسرے سے مشابہہ۔

لاتعداد رنگ تھے ـــــ ایک دوسرے میں گڈمڈ۔

اَن گنت آوازیں تھیں ـــــ ایک دوسرے میں مدغم۔

پھر بھی میں چلتا رہا ـــــ مگر راستہ طے ہوا یا نہیں، مجھے نہیں معلوم۔

اَب مَیں لت پت سانسوں کے ساتھ اس گولا مبر کے پاس کھڑا ہوں جس کے چاروں طرف سے راستے نکلتے ہیں۔

ہر طرف بھیڑ ہی بھیڑ ہے۔ بھیڑ ـــــ چہروں کی، بھیڑ رنگوں کی، بھیڑ آوازوں کی اور نہ جانے کس کس کی۔

مَیں ان میں اپنے ہم سفر کی تلاش شروع کرتا ہوں۔

یہ چہرا ـــــ وہ چہرا

یہ رنگ ـــــ وہ رنگ۔

یہ آواز ـــــ وہ آواز

مگر مُٹھیاں خالی کی خالی ہیں۔ بینائی کُند اور سماعت پاش پاش ہو گئی ہے۔

کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کچھ بھی سُنائی نہیں پڑتا۔

پھر کچھ سوچ کر، کچھ بے سوچے ہوئے مَیں اپنا سفر از سرِ نَو شروع کر دیتا ہوں۔

راستے، منزل اور ہم سفر کی کوئی خبر نہیں ـــــ

مگر اَندھا سفر اب بھی جاری ہے ....

حصار

پیر :

کل یونین کی میٹنگ تھی اس لئے کافی رات گئے گھر لوٹا پھر بھی آج صبح سویرے ہی آنکھ کھل گئی۔ بستر سے اُٹھ کر شیو کیا اور نہا دھو کر کپڑے تبدیل کئے۔ ناشتہ بھی جلدی ہی کر لیا تھا لیکن شاہدہ کو پراٹھے پکانے میں دیر ہو گئی۔ آٹھ بجے کے قریب بس اسٹینڈ پر پہنچا۔ لوگ قطار میں کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے لیکن آدھے گھنٹہ تک کوئی بس نہیں آئی۔ پھر ایک بس آئی مگر اتنی بھری ہوئی کہ تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ لوگ پائدان پر ایک پاؤں رکھے اور بعض صرف جوتے کی نوک ٹکائے لٹکے ہوئے تھے۔ نو بجے ایک بس کے پائدان پر مجھے بھی پاؤں ٹکانے کی جگہ مل گئی۔ دس بجے پسینے شرابور ہانپتا کانپتا دفتر پہنچا۔ سپرنٹنڈنٹ نے مجھے گھور کر دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ میں حاضری بنا کر سیدھا اپنی میز پر چلا گیا اور وہاں بیٹھ کر فائلیں ادھر اُدھر کرتا رہا۔ شام کو ساڑھے چھ بجے دفتر سے نکلا۔ آٹھ بجے بس ملی۔ ساڑھے نو بجے گھر پہنچا۔ تو عرفان سو چکا تھا۔ دس بجے منہ ہاتھ دھو کر کئی روز کے بعد آج شاہدہ کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد شاہدہ تکیے کا غلاف بنانے لگی اور میں اپنے بستر پر آ گیا۔

منگل :

سو کر اٹھا تو معلوم ہوا کہ آج بسوں کی ہڑتال ہے۔ لہٰذا جلدی جلدی شیو بنایا۔

ناشتہ کیا اور لنچ باکس ہاتھ میں لے کر کالونی کے اگلے موڑ تک پیدل گیا کہ شاید وہاں کوئی سواری مل جائے۔ لیکن کافی دیر کھڑے رہنے کے باوجود کوئی سواری نہیں ملی۔ ان ٹیکسیوں نے بھی جو فی سواری ڈھائی روپے کے حساب سے چلتی ہیں آج اپنا ریٹ بڑھا کر پانچ روپے کر دیا تھا۔ میں نے جیب ٹٹولی۔ تو اس میں صرف دو روپے ساٹھ پیسے تھے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اسٹیشن جا کر لوکل پکڑوں۔ اسٹیشن تک تقریباً ایک میل کا فاصلہ پھر پیدل طے کیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ایک لوکل ٹرین میں کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ جس سے کسی طرح دفتر پہنچا۔ دفتر میں آجکل کام بہت ہے۔ اس لئے سارا دن سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملی۔ دس بجے کی ٹرین سے روانہ ہوا تو گھر پہنچتے پہنچتے ساڑھے گیارہ بج گئے۔ شاہدہ اور عرفان دونوں سو چکے تھے۔ میں نے اتنی رات گئے شاہدہ کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اور خود سے کھانا نکال کر کھا لیا۔ اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے ہیں۔ لیکن نہ معلوم کیوں نیند نہیں آ رہی ہے۔

بُدھ :

چونکہ رات دیر سے سویا تھا اس لئے آج مجھے صبح اُٹھنے میں بھی دیر ہو گئی۔ شیو اور غسل کرنے کا وقت نہیں تھا۔ سو اس کے بغیر ہی صرف منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لئے اور گھر سے نکل پڑا۔ خوش قسمتی سے آج دس پندرہ منٹ کے اندر ہی بس مل گئی۔ مگر کچھ دُور چل کر راستہ میں ایک جگہ بس رُک گئی۔ معلوم ہوا کہ صدر مملکت کی گاڑی گزرنے والی ہے۔ جس کی وجہ سے ٹریفک بند کر دیا گیا ہے۔ خدا خدا کر کے کوئی پینتالیس منٹ بعد صدر کی گاڑی گزری۔ اور بس کو چلنے کی اجازت ملی۔ دفتر پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی اس لئے سپرنٹنڈنٹ نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "لوگ دیر سے دفتر آتے ہیں جس کی وجہ سے وقت پر کوئی کام نہیں ہو پاتا۔ اگر انہیں کچھ کہا جائے تو خفا ہو کر لڑائی جھگڑا کرتے ہیں۔" اس نے مجھے مخاطب تو نہیں کیا لیکن صاف ظاہر تھا کہ اس کا اشارہ میری ہی طرف ہے۔ کیونکہ ایک بار اسی

بات پر میرا اس سے جھگڑا ہو چکا ہے۔ دن بھر فائلوں میں غرق رہا۔ کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کب آفتاب غروب ہوا اور کب رات شروع ہو گئی۔ رات کے گیارہ بجے گھر پہنچا تو دیکھا کہ دروازہ کھلا ہے اور شاہدہ میرا انتظار کرتے کرتے کرسی ہی پر سو گئی ہے۔ میں نے اسے اٹھایا وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھی اور مجھے کھانا دے کر پھر سو گئی۔ میں بھی کھانا کھا کر خاموشی سے اپنے بستر پر چلا آیا۔

جُمعرات :

آج سویرے آنکھ کُھل گئی اور وقت پر تیار ہو کر دفتر کے لئے روانہ ہوا۔ بس بھی وقت سے مل گئی لیکن کالونی سے نکل کر جب بس مین روڈ پر پہنچی تو ایک منی بس سے ٹکرا گئی۔ ایک آدمی ہلاک ہو گیا اور کئی زخمی ہو گئے۔ زخمیوں کو اُٹھانے اور انہیں ہسپتال پہنچانے میں کافی دقّت پیش آئی۔ اور وقت بھی صرف ہوا۔ آفس دیر سے پہنچا تھا۔ مگر پہنچنے کے بعد دن بھر کام میں جُتا رہا۔ رات کے کوئی گیارہ بجے گھر واپس آیا۔ اس وقت عرفان سو گیا تھا اور شاہدہ کی آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں نے اسے سو جانے کو کہا لیکن وہ نہیں مانی۔ اور کھانے کا انتظام کرنے باورچی خانے میں چلی گئی۔ میں مُنہ ہاتھ دھونے کے لئے غُسل خانے میں گھُس گیا۔ اور وہاں سے واپس آ کر کھانے پر بیٹھ گیا۔ میرے اصرار پر شاہدہ نے بھی جیسے تیسے دو چار لقمے کھائے اور پھر عرفان کو تھپکی دیتے دیتے سو گئی۔ میں اس کے کافی دیر بعد تک جاگتا رہا۔ ایکسیڈنٹ کا پورا منظر اور اس میں ہلاک ہونے والے شخص کا چہرہ میری نظروں میں گھُومتا رہا۔

جُمعہ :

بیدار ہونے کے بعد بھی طبیعت کچھ مضمحل مضمحل سی رہی۔ کل کے حادثہ کا اثر اب تک ذہن پر موجود تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود ہر کام آج بہت سستی اور سست رفتاری کے ساتھ ہوا۔ تیار ہونے میں بہت وقت لگ گیا، اور دیر سے دفتر پہنچا۔ آج بس میں سوار ہوتے وقت ایک اَنجانا سا خوف دل پر مسلط تھا۔ دفتر میں کام بہت ہے اس لئے کافی

رات گئے تک بیٹھا کام کرتا رہا۔ پھر بھی کچھ زیادہ کام نہ ہو سکا۔ سارا دن دل بیٹھا بیٹھا سا رہا۔ اسی حالت میں گھر واپس آیا۔ شاہدہ عرفان کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اس نے بتایا کہ عرفان کو بخار آگیا ہے۔ میں نے شاہدہ سے کل عرفان کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لئے کہہ دیا ہے۔ کیا کروں ؟ مجھے بالکل فرصت نہیں۔

ہفتہ :

شاہدہ رات بھر سو نہیں سکی تھی۔ فجر کے وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔ سات بجے ہڑبڑا کر اُٹھی اور اُٹھ کر باورچی خانے کی طرف دوڑی۔ مگر ناشتہ بنانے میں کافی دیر ہو گئی۔ کیونکہ بیچ بیچ میں اسے عرفان کو دیکھنے کے لئے بھی اُٹھنا پڑتا تھا۔ ناوقت آفس پہنچا۔ میز پر فائلوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ قلم نکال کر کام میں جُت گیا۔ چار بجے تک فائلوں میں ڈوبا رہا۔ چار سے چھ بجے تک آفس میں اچھی خاصی ہوہڑب رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ایک سیکشن آفیسر کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ آج اس کی الوداعی پارٹی تھی۔ دفتر کے تمام لوگ اکٹھا ہوئے۔ ٹرانسفر ہو جانے والے افسر کے حسنِ سلوک اور خدمات کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا۔ حالانکہ جب سے وہ آیا تھا پورا دفتر اس سے نالاں تھا۔ چھ بجے اسے رخصت کر کے خدا حافظ کہا گیا۔ اور اس کے بعد سے سات بجے تک اس کی دفتری کارکردگی سے لے کر گھریلو معاملات تک پر تبصرہ ہوتا رہا۔ ہر آدمی اس کی بُرائیاں کر رہا تھا۔ سات بجے کے بعد پھر کام کی طرف رجوع ہوا۔ اور نو بجے تک سر جھکائے کام کرتا رہا۔ گیارہ بجے گھر آیا۔ عرفان کو اب تک بخار ہے۔ شاہدہ نے اسے دوا لا کر دیدی ہے۔ لیکن اب تک خاطر خواہ افاقہ نہیں ہوا۔ میں نے عرفان کو دیکھنے کے بعد کھانا کھایا اور بے سُدھ ہو کر بستر پر پڑ گیا۔

اتوار :

اتوار چھٹی کا دن ہے۔ اور اس اتوار کو مجھے کئی ضروری گھریلو کام کرنے تھے۔ لیکن سب کام مُلتوی کر کے آج بھی دفتر جانا پڑا۔ صاحب نے کہا تھا کہ اتوار کی صبح میں

ہی آجانا۔ کچھ کنفیڈنشیل کام ہیں — اس حکم کو میں کیسے ٹال سکتا تھا کیونکہ مجھے نوکری کرنی ہے۔ اور آگے ترقی کے دروازے بھی کھولنے ہیں۔ یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ اس کام کے لئے صاحب نے میرا انتخاب کیا۔ صبح کے آٹھ بجے سے رات کے دس بجے تک صاحب کے سامنے بیٹھا کام کرتا رہا۔ بارہ بجے واپس آیا تو شاہدہ نے یہ خوش خبری سُنائی کہ عرفان کا بخار اُتر گیا ہے۔ کھانا وغیرہ کھا کر تھکن سے چُور مَیں اپنے بستر پر چلا آیا۔ شاہدہ عرفان کے سینہ پر تیل کی مالش کر رہی تھی۔ کچُھ دیر بعد جب مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تو شاہدہ نے کہا "سو گئے کیا؟" — میں نے نیند سے بھرائی ہوئی آواز میں زیر لب مختصر جواب دیا۔ "ہوں"۔

شاہدہ چند لمحوں کے لئے خاموش رہی۔ پھر کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی ہے!"

شاہدہ کے اس جملے کا مطلب میں خوب سمجھتا ہوں۔ اس کے باوجود میں نے ناسمجھی کا مظاہرہ کیا۔

"میز پر سے کوئی رسالہ اُٹھا کر پڑھنے لگو"۔

اور یہ کہہ کر میں نے بڑی بے چارگی کے ساتھ لحاف کھینچ کر اپنا منہ چھپالیا۔

گنبد کی صدا

ہر گھڑی، ہر پل چابک گھماتا ہوا گزرتا ہے۔
معصوم خواہشوں کے سینے میں بے رحم نوکیلے خنجر اُترتے رہتے ہیں۔
"ایسا لگتا ہے ——"
"ایسا لگتا ہے جیسے اب جنگ شروع ہو جائے گی۔ جتنی جلد شروع ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ کافی مال اِسٹاک کر لیا ہے۔ دھندا تگڑا ہوگا اِس لئے کہ ——"
"اِس لئے کہ پچھلی جنگ نے ہی ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ فضا میں خون کی مہک اَب تک رچی ہوئی ہے۔ ہر طرف بے روزگاری اور بے کاری کے اژدہے دندناتے پھر رہے ہیں۔ کام ——"
"کام مِل گیا ہے۔ کافی پیسے دینے پڑے تب کہیں ٹنڈر منظور ہوا پھر بھی مطالبہ ——"
"مطالبہ تو مزدوروں نے بہت پہلے ہی پیش کیا تھا۔ جب وہ منظور نہ ہوا تو اُنھوں نے ہڑتال کر دی جس کے نتیجے میں فیکٹری ڈیڑھ ماہ تک بند رہی۔ اس کے بعد یونین کے نمائندوں اور انتظامیہ کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا لیکن چند ہی دنوں بعد مالک نے لاک آوٹ کر دیا۔ نتیجہ ——"
"نتیجہ یہ ہے کہ گرانی بڑھتی جارہی ہے۔ پہلے آمدنی کا مقابلہ مہنگائی سے ہو رہا تھا۔ اب مہنگائی کا مقابلہ مہنگائی سے ہو رہا ہے۔ ہر چیز کے دام ——"
"دام ہی بہت ہیں ورنہ لڑکیاں تو ہر گلی میں مِلتی ہیں۔ یہ لڑکیاں ——"
"یہ لڑکیاں سر کا بوجھ بن گئی ہیں۔ اتنے پیسے نہیں کہ ان کے ہاتھ پیلے کر سکوں۔ کبھی کبھی

جی چاہتا ہے جنگل کی طرف نکل جاؤں اور وہیں ـــــ"

"اور وہیں ایک وزیر سے ملاقات ہو گئی۔ اُس سے میں نے دوستی گانٹھ لی ہے۔ اب سب کام آسانی سے ہو جائے گا کیونکہ اُسے بھی تو انتخابات ـــــ"

"انتخابات شاید جلد ہی ہوں لیکن اس سے کیا فرق پڑے گا کیونکہ زر، زمین اور زن جو پہلے فساد کی جڑ تصور کی جاتی تھی اب اِنتخاب میں کامیابی کی کنجی سمجھی جانے لگی ہے۔"

"یہ ملک ـــــ"

"یہ ملک کچھ چلتا ہوا نظر نہیں آتا اِس لئے کہ کوئی بھی اپنی ناک سے آگے دیکھنے کو تیار نہیں۔ محبِ وطن لوگ اقلیت میں ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک دن ـــــ"

"ایک دن ہم اُنھیں اُن کے کئے کا مزا چکھا دیں گے۔ اب ہم کافی مضبوط اور طاقت وَر ـــ"

"کافی مضبوط اور طاقت وَر ملک کا باشندہ کہہ کر اُس غیر ملکی اخبار نویس نے مجھے ایکدم چونکا دیا۔ جب میں نے اُس سے وضاحت چاہی تو اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا ـــــ تم لوگ برسوں سے اپنے ملک کی جڑیں کاٹنے میں لگے ہو پھر بھی تمھارا مُلک اب تک قائم ہے۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی نا کہ تمہارا ملک کافی مضبوط اور طاقت وَر ہے۔ اس کے سوا ـــــ"

"اِس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے کہ ہم خاموشی کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتے رہیں۔ چہرے بدل رہے ہیں لیکن ملک کی قسمت نہیں بدلتی۔ عوام کی حالت نہیں تبدیل ہوتی۔ دراصل ہمارے یہاں شعور ـــــ"

"شعور ناپید ہو گیا ہے۔ یوں تو ہمارے ہاں شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ مصوّر بھی ہیں اور دانش وَر بھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سبھوں کو سانپ سُونگھ گیا ہو۔ کہیں سے روشنی کی کوئی کرن نہیں پھُوٹتی۔ کوئی شاعر، کوئی فنکار ـــــ"

"کوئی شاعر کوئی فنکار دُوسروں کے لئے نہیں لکھتا ـــ وہ صرف اپنے لئے لکھتا ہے۔ وہ دوسروں کے لئے یا معاشرے کے لئے لکھے بھی کیوں جبکہ معاشرہ اُسے کچھ نہیں دیتا سوائے ٹیسوں

اور زخموں ــــ"

"زخموں کا علاج ایک عرصے تک کراتا رہا۔ انجکشن بھی لگوائے۔ دوائیاں بھی کھائیں لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اب ڈاکٹر کہتا ہے کہ تمھیں کینسر ہوگیا ہے۔ اس بار موقع ملا تو ــــ"

"موقع ملا تو ان صاحب سے بھی مل لوں گا۔ شاید کام بن جائے۔ دو سال سے مسلسل بیکار رہتے رہتے عاجز آگیا ہوں۔ وقت ہی ــــ"

"وقت ہی نہیں ملتا کہ اپنا یا گھر کا کوئی کام کر سکوں۔ ایک بچاری بیوی کیا کیا کرے۔ کہاں کہاں جائے۔ اُس غریب کو تو بچّوں سے ــــ"

"بچّوں سے تنگ آگیا ہوں۔ ہر سال پابندی کے ساتھ ایک بچّہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آخر اس کا کیا حل ــــ"

"حل یوں تو ہر چیز کا موجود ہے یا پھر کسی چیز کا بھی نہیں ــــ کیونکہ ہر مسئلے کا حل نئے مسائل پیدا کر دیتا ہے اور یہ چکر ــــ"

"ہر گھڑی، ہر پل چابک گھماتا ہوا گزر رہا ہے۔

معصوم خواہشوں کے سینے میں بے رحم نوکیلے خنجر اُتر رہے ہیں۔

گاڑی کدھر جا رہی ہے؟ آگے کی طرف یا پیچھے کی طرف؟

اگر یہ آگے کی طرف جا رہی ہے تو اس کی رفتار بہت سُست ہے۔ ہو سکتا ہے منزل پر پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے۔

اور اگر پیچھے کی طرف رواں ہے تو اس کی رفتار بے انتہا تیز ہے۔ ڈر ہے کہیں کوئی جان لیوا حادثہ نہ پیش آجائے۔

مس مارگریٹ

مس مارگریٹ سے میری پہلی ملاقات ہوٹل نٹ رلج میں ایلس کے ذریعہ ہوئی تھی۔ تعارف اور چند رسمی باتوں کے بعد سگریٹ کا تیز تیز کش لیتے ہوئے مارگریٹ نے انگریزی میں جو الفاظ کہے تھے اس کا مطلب کچھ اس طرح ہے ——— "معاف کیجئے گا مسٹر پال! مجھے چھوٹی چھوٹی آنکھوں، کڑی کڑی مونچھوں اور چوڑے چکلے شانوں والے مردوں سے بڑا ڈر لگتا ہے ——— نہ جانے کیوں؟" ——— اور میں خفیف سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس سے پہلے مجھے کسی نے ——— کم سے کم کسی عورت نے اس طرح طنز کا نشانہ نہیں بنایا تھا۔ جی تو چاہا کہ کہہ دوں۔ مس مارگریٹ! آپ نہ جانے کس قسم کی عورت ہیں ورنہ دوسری عورتیں تو ایسے ہی مردوں کو پسند کرتی ہیں ——— لیکن میں کچھ کہہ نہ سکا اس لئے کہ میں اس اچانک حملے کے لئے تیار ہی نہیں تھا اور خفیف سا ہو کر صرف مسکرا دیا۔ یہ تلخ مسکراہٹ بہت دیر تک میرے ہونٹوں پر، بلکہ سارے جسم میں انگارے کی طرح دوڑتی رہی۔

میں نے کچھ وقفے کے بعد کافی کی چسکی لیتے ہوئے سر اٹھا کر مس مارگریٹ کے چہرے کی طرف دیکھا اور ان کے اوپری لب کے اوپر ہلکی ہلکی مونچھ کی سی سبز ریکھائیں دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ میں کہوں ——— معاف کرنا مس مارگریٹ! مونچھیں مردوں کے لئے عیب نہیں بنتیں، ہاں! عورتوں کے لئے یہ عیب کی بات ضرور ہے اور ایک حد تک خطرناک بھی ——— لیکن اس بار بھی میں کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف اندر ہی اندر کھولتا رہا۔

ایلس نے شاید میری کیفیت کا اندازہ لگا کر بات کا رخ دوسری جانب موڑ دیا تھا۔ پھر

مختلف موضوعات پر باتیں چل نکلیں ـــــ معاشیات سے سائنس، سائنس سے سماجیات، سماجیات سے ادب ـــــ اور ادب سے جنسیات کی طرف۔

ایلس زور زور سے باتیں کر رہی تھی اور بار بار مجھے مخاطب کرتی تھی، تاکہ گفتگو سے میرا وہ زخم مندمل ہو جائے جو مارگریٹ نے مجھے لگایا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جنس سے متعلق گفتگو میں مس مارگریٹ نے حصہ نہیں لیا تھا اور تقریباً خاموش ہو رہی تھیں۔ انھوں نے ایلس کو بھی آہستہ آہستہ بولنے کی ہدایت کی اور پھر شاید موضوع بدلنے کی غرض سے مجھے مخاطب کر کے کہا تھا: "میری باتوں کا بُرا نہ ماننا مسٹر پال۔ نہ جانے کیوں مجھے مردوں سے بڑا ڈر لگتا ہے ـــــ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مرد بھیڑیے ہیں جو عورتوں کو کھا جانا چاہتے ہیں" ـــــ اور پھر کچھ رُک کر بولی تھیں ـــــ "بھلا سختی اور نرمی کا بھی کہیں میل ہوتا ہے، یہ انتہائی غیر فطری ہے۔"

ایلس نے بڑے غور سے مس مارگریٹ کے چہرے کی طرف دیکھا جیسے وہ اس بے ربط جُملے کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

میں مس مارگریٹ کے بہ ظاہر اس بے ربط جملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا، میں نے جواب دیا ـــــ "سختی کو نرمی کی ضرورت ہوتی ہے مس مارگریٹ! اور نرمی کو سختی کی۔ یہ عین فطرت ہے اور پھر یہ بھی تو ہے کہ دو متضاد چیزوں کے امتزاج سے بہت ہی اچھی اور حسین تخلیق وجود میں آتی ہے" ـــــ ایلس حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ اس نے سمجھا اب میں فلسفے کی باتیں کرنے لگا ہوں۔ اکتاہٹ محسوس کرتے ہوئے اس نے کہا ـــــ "اچھا اب ہم لوگ چلیں۔ رات کافی گزر گئی ہے۔"

میں اور مس مارگریٹ نے حامی بھر دی اور پھر شب بخیر کہہ کر ہم لوگ ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔

دوسری شام ایلس آئی تو وہ بہت اُداس تھی۔ میں نے اس خیال سے کہ خاموش، اور پُر فضا وادی کی سیر سے اس کا دل بہل جائے گا کہا ـــــ "چلو آج پہاڑی کی طرف چلیں۔" اس

نے آہستہ سے کہا۔ "چلو!"

اور ہم شہر سے دور پہاڑی کی طرف گھومنے نکل گئے۔ پہاڑی کے برابر برابر جانے والی سڑک پر چلتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ ایلس کی کمر میں حمائل کر دیا۔ وہ کچھ نہیں بولی اور خاموشی سے میرے شانہ بہ شانہ چلتی رہی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا وہ پھر بھی خاموش رہی۔ مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے چھیڑنے کی غرض سے اس کے بائیں رخسار پر زور سے چٹکی لی۔ اس کا چہرہ گلنار ہوگیا۔ اپنی پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے وہ بولی ــــ "اوہ! زیادہ سلی نہ بنو تمہارے ہاتھ بڑے سخت ہیں۔"

"اچھا اب تم بھی مس مارگریٹ کی طرح سختی اور نرمی کی باتیں کرنے لگیں؟" میں نے کہا۔ "نہیں ایسی بات نہیں ہے، میں مس مارگریٹ نہیں ہوں۔" ایلس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ میں مس مارگریٹ کے بارے میں دریافت کروں کہ وہ کون ہے اور کیا کرتی ہے۔ میں نے کسی قدر سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ــــ "ایلس ڈارلنگ! یہ مس مارگریٹ مجھے عجیب لگتی ہے۔ کل تم نے مجھے اس سے ملایا تو سہی لیکن میں یہ نہ جان سکا کہ وہ کرتی کیا ہے۔" ایلس ہنسنے کے سے انداز میں بولی۔ کبھی کبھی تو میں بھی تمہیں عجیب لگتی ہوں ــــ کیوں؟

"نہیں ڈارلنگ! تمہاری بات اور ہے۔۔۔۔"

ایلس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ــــ "میری بات اور ہے تو تم اوروں کی بات کیوں کرتے ہو؟ تمہیں کیا پڑی ہے اس میں اس قدر دل چسپی لینے کی۔"

"نہیں تم مجھے غلط نہ سمجھو۔ مجھے اس سے کوئی دل چسپی نہیں لیکن یوں ہی۔۔۔۔"

"وہ ایک سرکس میں کام کرتی ہے" ــــ ایلس نے مختصر سا جواب دیا۔

کئی دنوں بعد میں اور ایلس نٹ راج میں بیٹھے تھے کہ یک بیک مس مارگریٹ وہاں آ پہنچیں۔ کافی دیر تک کرنے کے بعد جب وہ جانے لگیں تو انھوں نے ایلس سے کہا ــــ "کل تم سرکس دیکھنے ضرور آنا۔ کل ہمارا شو ہے اور ساتھ میں پال کو بھی لیتی آنا گو مجھے اس سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

میں مس مارگریٹ کی اس بات پر ہنس دیا۔ ایلس بھی ہنسنے لگی۔

دوسرے دن میں اور ایلس سرکس دیکھنے پہنچے تو مس مارگریٹ نے ہم لوگوں کا پُرجوش استقبال کیا۔ ہمارے لئے علیحدہ کرسیاں لگوا کر مارگریٹ چلی گئیں اور جاتے ہوئے ایلس کو یہ ہدایت کرگئیں کہ وہ شو ختم ہونے کے بعد ان سے ضرور ملے۔

کچھ دیر بعد پروگرام شروع ہوا تو ہم سرکس کے عجائبات میں دل چسپی لینے اور جوکروں کی حرکات وسکنات پر ہنسنے لگے۔ پھر یکایک مس مارگریٹ نمودار ہوئیں۔ بالکل سفید اور چُست کپڑوں میں ملبوس۔ وہ ایک لکڑی کے تختے کے سہارے سر پیچھے کی جانب جھکا کر کھڑی ہوگئیں۔ پھر سرکس کا ایک دوسرا جوکر ان کے قریب آیا اور اس نے ایک موم بتی مس مارگریٹ کے سینے پر کھڑی کرکے اسے جلادیا۔ مس مارگریٹ اس طرح سر پیچھے کی جانب جُھکائے کھڑی تھیں جیسے سر کا حصّہ ان کے جسم میں ہو ہی نہیں۔ سامنے سے دیکھنے والوں کو ان کا سینہ ہی سر کی جگہ دکھائی دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا ایک بونا جوکر ان کے پاس آیا اور اس نے ایک سگریٹ مس مارگریٹ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اسی حالت میں انھوں نے بونے جوکر کے ہاتھ سے لائٹر لیکر سگریٹ سُلگایا اور اسے ہونٹوں سے لگاکر تیز تیز کش لینے لگیں۔ دھوئیں کے سفید سفید دائرے اِدھر اُدھر بکھرنے لگے۔ اتنے میں ایک دوسرا اداکار بالکل سیاہ لباس میں ان کے سامنے تقریباً ۲۵ فٹ کے فاصلے پر آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور اُٹھایا اور باری باری اس کی ساتوں گولیاں ختم کردیں — ہر گولی موم شمع کی لَو کو چھوتی ہوئی مس مارگریٹ کے مرغولوں میں سے ہو کر گزر گئی۔ دیکھنے والے سہمے ہوئے تھے کہ اگر نشانہ ذرا بھی چوکا یا مس مارگریٹ کے جسم کو ذرا بھی جُنبش ہوئی تو ان کا جسم ریوالور کی گولیوں سے چھلنی ہو جائیگا۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور مس مارگریٹ تالیوں کے شور میں اپنا سر اٹھا کر کھڑی ہوگئیں۔ جب وہ گیلری کی طرف سے گزرتی ہوئی ہم لوگوں کے پاس سے تو میں نے ان سے کہا۔ "مس مارگریٹ! آپ کا شو بہت اچھا اور کامیاب رہا۔ اب ہم لوگوں کو اجازت دیجئے۔"

"ابھی تو کئی پروگرام باقی ہیں۔ دیکھ کر جانا" — انھوں نے جواب دیا۔

"نہیں، آج موقع نہیں ہے۔ ایسا ہی ہے، تو پھر کبھی دیکھ لوں گا۔"

"اچھا تو آپ جا سکتے ہیں" ـــــ انھوں نے کہا اور پھر ایلس کا ہاتھ دبا کر بولیں ـــــ
"تم ٹھہر جاؤ پورا شو دیکھ کر جانا۔ اتنی جلدی کیا ہے؟"

ایلس نے پہلے میری طرف دیکھا پھر بولی ـــــ "نہیں مس مارگریٹ! بہت دیر ہو جائے گی، مجھے جانے دیجیے۔"

"دیر ہو جائے گی تو ڈر کس بات کا ہے۔ میرے ساتھ رہنا اور صبح چلی جانا۔ میں کھا تھوڑی ہی جاؤں گی۔"

ایلس نے ہنس کر کہا۔ "نہیں نہیں مس مارگریٹ! آپ کا شو دیکھ لیا۔ بس اب اجازت دیجیے۔"

مارگریٹ نے افسردہ سی ہو کر کہا، "جیسی تمہاری مرضی" ـــــ اور پھر شب بخیر کہہ کر وہ ایک خیمے میں چلی گئیں۔ میں اور ایلس سرکس کے مختلف پروگراموں، جوکروں اور مس مارگریٹ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے واپس چلے آئے۔

اس کے بعد کئی روز تک میں نے مس مارگریٹ کو نہیں دیکھا۔ ایلس سے ان کے متعلق دریافت کیا تو کہنے لگی، "تمہیں کیا پڑی ہے مس مارگریٹ میں اس قدر دل چسپی لینے کی۔ نہیں آتی تو نہ آئے۔"

میں نے کہا ـــــ "کہیں وہ ہم لوگوں پر اس رات کے بعد سے جب ہم سرکس دیکھنے گئے تھے، خفا تو نہیں؟"

"اگر خفا بھی ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟" ـــــ ایلس نے رکھائی سے جواب دیا۔

کئی روز گزر گئے ـــــــــــــــــــ

ایک دن نٹ راج میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ بڑا خاموش خاموش سا۔ مس مارگریٹ نے اس کا ہم لوگوں سے تعارف کرایا۔

"یہ ہیں مسٹر پال اور یہ ہیں مس ایلس، ہماری دوست"۔۔۔۔ اور پھر اس نوجوان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہا ۔۔۔ "یہ ہیں مسٹر ڈی کوسٹا ۔۔۔ میرے فیانسی۔ وہی جو سرکس کے شو میں مجھ پر گولیاں چلاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ ذرا سا مسکرائیں۔

"گلیڈ ٹو میٹ یو۔"

"گلیڈ ٹو میٹ یو۔"

"گلیڈ ٹو......"

"آخر آپ سختی کی اہمیت کی قائل ہو گئیں نا مس مارگریٹ!" میں نے کہا۔ وہ کچھ شرما سی گئیں ۔۔۔ نہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ کچھ خفیف سی ہو گئیں۔

میں نے پھر کہا: "یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ زیادہ اجتناب کا نتیجہ عموماً التفات ہی ہوتا ہے۔"

مس مارگریٹ خاموش رہیں۔

ڈی کوسٹا نے بھی کچھ نہیں کہا ۔۔۔ وہ صرف غور سے ہمیں دیکھتا رہا۔

"اب جا کر مسٹر ڈی کوسٹا کا نشانہ ٹھیک بیٹھا ہے" ۔۔۔ ایلس نے بھی چوٹ کی۔

ایلس نے کافی کا آرڈر دیا ۔۔۔ اور ہم سب کافی پینے میں مشغول رہے۔

کئی روز بعد ایلس نے مجھے اطلاع دی کہ مس مارگریٹ نے مسٹر ڈی کوسٹا سے شادی کرلی ہے اور اب انھوں نے سرکس میں کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔

میں نے کہا ۔۔۔ "چلو اچھا ہوا۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔"

ایلس خاموشی سے مسکرانے لگی۔

دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ایلس میرے کمرے کی دیوار پر کلنڈر ٹانگنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے اس کے پیچھے سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے بازوؤں میں ڈال دیئے۔

"چھوڑو مجھے" ـــــ ایلس چیخنے کے سے انداز میں بولی۔

"اوں ـــ ہوں ـــ" میں نے اس کی کلائیوں کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو ـــ میں تمہیں ایک خبر سناتی ہوں۔"

"ایسے ہی سناؤ نا! کیا ہرج ہے؟ ـــ جب بولنے اور سننے والے آگے پیچھے ہوں ـــ میرا مطلب ہے جب دونوں کا رُخ ایک ہی جانب ہو تو گفتگو کا کچھ اور ہی مزا آتا ہے۔"

"اُف ـــ فوہ ـــ چھوڑو بھی، زیادہ سلّی نہ بنو۔ میں تمہیں اس سے زیادہ مزے دار بات سناتی ہوں۔"

"اچھا تو لو۔ یوں ہی سہی" ـــ میں نے اپنے بازو نیچے کر لئے۔

"جانتے ہو مس مارگریٹ ......"

"مس مارگریٹ نہیں بلکہ مسز مارگریٹ۔"

"ارے یہی تو اصل بات ہے کہ مسز مارگریٹ پھر سے مس مارگریٹ ہو گئی ہیں۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ مسز مارگریٹ پھر سے مس؟"

"ہاں۔ ہاں! ان کی ڈائیوورس ہو گئی ہے۔"

"آں! وہ کیوں؟"

"وجہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ مزے دار بات تو یہ ہے کہ ہسبینڈ وائف دونوں میں سے کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں۔"

مجھے سخت حیرت ہوئی۔ کچھ وقفے کے بعد میں نے ایلس سے دریافت کیا۔

"تمہیں آخر یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"خود مس مارگریٹ آئی تھیں مجھے خبر کرنے اور کیسے!" ایلس نے "مس" کچھ اس انداز سے کہا کہ مجھے ہنسی آگئی۔

"میرے لئے کوئی جاب دیکھو مسٹر پال! میں اپنی بیکاری سے تنگ آگئی ہوں۔" مس مارگریٹ نے مجھ سے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"کوشش کروں گا مس مارگریٹ! آپ مطمئن رہیئے۔"

تقریباً ایک ہفتہ بعد میں نے مس مارگریٹ کو ایلس کے ذریعہ بلوا کر ان سے کہا: "یہاں نرسری اسکول میں ایک مسٹریس کی جگہ خالی ہے، اگر آپ چاہیں تو وہ جگہ آپ کو مل سکتی ہے۔"

"نو نو مسٹر پال! آئی ڈونٹ وانٹ ٹو بی ان چلڈرنس سوسائیٹی۔" انہوں نے بڑی سختی سے جواب دیا۔

میں نے کہا: "اچھا تو پھر آپ کیلئے کوئی دوسری جگہ دیکھوں گا۔"

مس مارگریٹ نے مجھے شب بخیر کہا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ایلس بھی ساتھ انھیں گیٹ تک چھوڑنے چلی گئی۔

میں نے کھڑکی کے شیشے سے دیکھا کہ مس مارگریٹ ایلس کے شانوں پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہی ہیں۔ ان کی باتیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ رہ رہ کر صرف ایلس کے ہنسنے کی آواز احاطے کی خاموش فضا میں گونج جاتی تھی۔ تقریباً پون گھنٹہ بعد ایلس کمرے میں واپس آئی۔

میں اخبار دیکھ رہا تھا کہ اچانک مس مارگریٹ میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"مسٹر پال! سروجنی ڈانسنگ انسٹی ٹیوٹ میں ایک کوچ کی جگہ خالی ہوئی ہے اگر آپ کوشش کریں تو وہاں میری بحالی ہو سکتی ہے۔" انھوں نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے ـــــ میں دیکھوں گا" ـــــ میں نے جواب دیا۔

کئی روز کی دوڑ دھوپ کے بعد مس مارگریٹ کی بحالی ہو گئی۔

اس کے کچھ دنوں بعد مینا بازار میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ اس کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے کہا ـــــ "یہ رنجنا ہے ـــــ رنجنا مکرجی۔ ہماری انسٹیٹیوٹ

کی مقبول لڑکیوں میں سے ایک، یہ ٹوئسٹ بہت اچھا ناچتی ہے۔"

رنجنا نے پہلے ایلس کو پھر مجھے نمستے کی اور خاموش ہو رہی۔ جب ہم لوگ مینا بازار کی سیر کے بعد ٹی کارنر میں آئے تو مس مارگریٹ نے ایلس کا ہاتھ دبا کر کہا "تمہاری ایک پارٹی مجھ پر باقی ہے۔ میں یہ قرض ادا کر دینا چاہتی ہوں، لیکن یہاں شہر میں نہیں کسی ہِل اسٹیشن پر۔" پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا "گو مجھے مردوں سے بڑا ڈر لگتا ہے لیکن اس سفر میں آپ کو بھی ساتھ چلنا ہوگا مسٹر پال! رنجنا بھی ہمارے ساتھ ہوگی۔"

میں صرف مسکرا دیا۔ مس مارگریٹ اگلے اتوار کو ٹیگور ہِل چلنے کا پروگرام بنانے کے بعد رنجنا کو لے کر چلی گئیں۔ وعدے کے مطابق اتوار کے دن صبح سویرے وہ ہمارے ہاں آگئیں۔ خلاف توقع وہ اکیلی تھیں اس لئے ایلس نے ان سے دریافت کیا ___ کیوں رنجنا کہاں ہے؟"

"اس کی ماں کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے ___ وہ گھر چلی گئی۔" انھوں نے جواب دیا ___

"بڑی نیک اور پیاری لڑکی ہے۔" ایلس نے پھر کہا۔

"وہ ہوتی تو کچھ اور لطف آتا پک نک کا ___ میں تم لوگوں کو اس کا ڈانس دکھاتی۔ اس کے جسم میں اتنا گداز اور ایسا لوچ ہے کہ دیکھنے والے محوِ حیرت رہ جاتے ہیں۔"

ٹیگور ہِل کے ریسٹ ہاؤس میں ہم لوگوں نے دو کمرے ریزرو کروا رکھے تھے۔ جب ہم تفریح سے لوٹے تو کافی رات گزر چکی تھی۔ میں نے ایلس سے کہا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔ تم اور مس مارگریٹ دوسرے کمرے میں جا کر سو رہو۔"

مس مارگریٹ ہاتھ چمکا کر بولیں ___ "ہاں بابا! میں تو کسی شیر کے مان میں سونے سے رہی۔"

ایلس ہنستی ہوئی مس مارگریٹ کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے اتنے زوروں کی نیند آ رہی تھی کہ میں نے ایلس اور مارگریٹ کے گڈ نائٹ کا جواب بھی نہیں دیا اور چادر سے منہ ڈھانپ کر سو رہا۔

رات کے دو بجے ہوں گے کہ میرے کمرے کے دروازے پر زور زور سے دستک کی آواز ہوئی۔

"کون ہے ؟" میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں ــــ دروازہ کھولو ــــ" یہ آواز ایلس کی تھی۔

میں نے لائٹ جلاکر دروازہ کھولا۔ ایلس ہولے ہولے قدم رکھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

"کیوں ؟ کیا ہوا ؟ ــــ اتنی رات گئے تم یہاں کیوں چلی آئیں ؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا ــــ ؟" میں نے ایک ہی سانس میں اس سے کئی سوال کر ڈالے۔

"میں اُس کمرے میں نہیں سوؤں گی ــــ مس مارگریٹ بہت خراب عورت ہے" ــ

اس نے اتنا کہا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اسلئے خاموشی سے اسے بیڈ پر سُلاکر خود بھی سو گیا۔

ہل اسٹیشن سے اتنی جلدی لوٹنے کا ارادہ تو نہیں تھا لیکن ایلس کے اصرار پر ہمیں اس کے دوسرے ہی دن واپس آجانا پڑا۔

پھر ایک طویل عرصہ تک مس مارگریٹ سے ملاقات نہیں ہوئی۔

کئی ہلال اُبھرے اور ڈوبے۔

کسی نے بتایا کہ مس مارگریٹ ان دنوں بہت اُداس اُداس اور کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی محبوب شاگرد رنجنا مکرجی کا انتقال ہو گیا ہے۔ رنجنا کئی مہینے سے بیمار تھی اور بہت لاغر اور نحیف ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اسے کوئی خطرناک قسم کا جنسی مرض ہو گیا تھا۔

مجھے یہ سب جان کر بہت افسوس ہوا اس لئے کہ رنجنا بہت پیاری اور سوشیل لڑکی تھی اور اس سے رقص کے فن کی بہت ساری اُمیدیں وابستہ تھیں۔

بہت دنوں بعد نٹ راج میں مِس مارگریٹ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے لانبے لانبے بالوں اور کتابی چہرے والی ایک لڑکی کا تعارف کراتے ہوئے ہم سے کہا۔ "یہ ہے شانتا کھرے۔ ہماری اسٹوڈنٹ، بھارت ناٹیم سیکھ رہی ہے" —— پھر بہت دیر تک ہم لوگ رنجنا اور اس کی جواں مرگی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ سب کے چہروں پر اُداسی اور خاموشی رہی۔ مِس مارگریٹ کی آنکھیں بھیگی ہوئی ہونے کے باوجود کسی گہرے خواب میں ڈوبی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

اس کے بعد سے مِس مارگریٹ ہمیں جہاں بھی ملتیں، شانتا ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتی۔ مختلف اوقات میں شانتا کے متعلق انھوں نے جو باتیں ہمیں بتائیں وہ کچھ یوں تھیں ——

"شانتا مرد نہیں لیکن اس کے جسم میں مردوں جیسی کرختگی اور گٹھاؤ ہے۔"

"شانتا بڑی نیک اور فرماں بردار لڑکی ہے۔"

"شانتا اسپورٹس مین لی گرل ہے۔"

"شانتا ...."

ایک بار نیو مارکیٹ میں مِس مارگریٹ سے ملاقات ہوئی وہ ایک ہاتھ میں بارن ویٹا کا ڈبہ لئے تھیں اور ہونٹوں سے سگریٹ لگی تھی۔ مختلف قسم کی ٹافیاں خریدنے اور ہمیں دینے کے بعد انھوں نے کہا —— "ایلس تو اب مجھ سے خفا خفا سی رہنے لگی ہے مسٹر یال!"

ایلس نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "نہیں! میں خفا کیوں ہونے لگی۔"

"تو پھر خاموش خاموش کیوں رہتی ہو؟ پہلے تو تم ایسی نہیں تھیں۔"

"نہیں کوئی خاص بات نہیں —— یوں ہی ....."

"اِدھر کچھ عرصے سے میں مارک کر رہی ہوں کہ میں جہاں بھی تمہیں ملتی ہوں، تم مجھے گھور گھور کر دیکھتی ہو، کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"نہیں تو کوئی ایسی بات نہیں۔"

مِس مارگریٹ کچھ اور سنجیدہ ہو گئیں —— "یہ دُنیا ہے ایلس۔ یہاں مختلف ٹائپ

اور ٹیسٹ کے لوگ ہیں۔ سب تمہاری طرح تو ہیں نہیں اس لئے ان میں سے لوگوں سے بلکہ ہو سکتا ہے تمام لوگوں سے تمہیں کچھ نہ کچھ اختلاف ہو اور ایسا ہوتا ہے۔ اب اگر ایسی حالت میں تم ہر شخص سے منہ پُھلاتی پھر دگی تو دُنیا کا کام کیسے چلے گا؟

ایلس خاموش رہی۔

مِس مارگریٹ نے پھر مجھے مخاطب کیا ــــ "ہاں مسٹر یال! ایک ٹریجڈی سنو۔ بیچاری شانتا اِن دنوں سینی ٹوریم میں ہے۔ اُسے ......"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مِس مارگریٹ؟ اس کی صحت تو اچھی خاصی تھی۔" مَیں نے حیرت سے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں مسٹر یال! لیکن کیا کیا جائے؟" ــــ مِس مارگریٹ نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا ــــ

ایک دن ــــ یہ خبر ملی کہ مِس مارگریٹ انسٹی ٹیوٹ کے ہوسٹل میں کسی لڑکی کے ساتھ ننگی حالت میں چمٹی ہوئی دیکھی گئی ہیں۔ مِس مارگریٹ اور اس لڑکی کے جسم پر کپڑے کی ایک دھجی بھی نہیں تھی۔ صرف کمر میں بیلٹ کی قسم کی کوئی چیز لگی ہوئی تھی اور دونوں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ انھیں اس حالت میں سب سے پہلے ہوسٹل کی آیا نے دیکھا تھا اور پھر اس نے کچھ اور لڑکیوں اور ہوسٹل کی وارڈن کو کمرے کے روشن دان سے یہ نظارہ دکھایا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس آیا کے مِس مارگریٹ سے بہت پہلے سے اختلافات چلے آ رہے تھے۔

یہ خبر ہوسٹل سے ہوتی ہوئی انسٹی ٹیوٹ کی پرنسپل کے پاس پہنچی اور پھر سارے شہر میں مشتہر ہو گئی۔ میں یہ جان کر جس کیفیت سے دوچار ہوا وہ کچھ عجیب سی تھی۔ پہلے تو مجھے ایسا لگا جیسے یہ بہت ہی عجیب و غریب اور چونکا دینے والی بات ہے اور پھر فوراً مجھے احساس ہوا کہ جیسے میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مَیں تو اس بات کو بہت پہلے سے جانتا تھا۔ شاید اس وقت سے جب مِس مارگریٹ سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

یہ ضرور ہے کہ ان کا یہ پہلو پہلے کچھ دُھندلا دُھندلا سا تھا اور اب بالکل صاف اور روشن ہو کر میرے سامنے آ گیا تھا۔

دوسرے دن یہ اطلاع ملی کہ مس مارگریٹ نے خودکُشی کر لی۔ اس خبر نے بھی مجھے پورے طور پر چونکایا نہیں ــــــ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں یہ اور سب کچھ پہلے سے ہی جانتا تھا ــــــ ہاں! جس روز سے میں نے یہ خبر سُنی ہے اس روز سے مہاتما بودھ کے متعلق بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں جنھوں نے کہا تھا کہ ــــــ "درد گناہ کا حاصل ہوتا ہے"۔ شاید مہاتما بودھ کی نظر صرف ایک پہلو پر تھی ورنہ وہ یہ بھی ضرور کہتے کہ ــــــ "گناہ درد کا ثمرہ ہوتا ہے"۔ میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ کیا درد کی اس جوالا مکھی کو شانتی مل گئی ہوگی جو مس مارگریٹ کے جسم کے گوشے گوشے میں بھڑک رہی تھی؟ کیا موت انسان کو تمام دُکھوں سے نجات دلا دیتی ہے؟ ــــــ کیا پیاسی رُوحوں کی پیاس مرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے یا..... یا.....!

بے زمیں بے آسماں

اُس بے در و دیوار سیہ خانے میں وہ چاروں ایک دوسرے سے بے خبر اور بالکل تنہا اپنے اپنے عذاب کی میعاد پوری کر رہے تھے۔ کوئی کسی سے آشنا نہ تھا اور سب کے سب اپنے ہونے کی گواہی اپنے سامنے خود ہی دے رہے تھے۔ جب اپنی گواہی آپ ہی دیتے دیتے اپنے ہونے میں شبہ پیدا ہونے لگا تو ایک نے زوردار چیخ بلند کی تاکہ کوئی دوسرا اس کے ہونے کی شہادت دے سکے۔ دوسرے نے اس کی چیخ سُن کر مسرت بھری آواز میں کہا۔ "ہاں! میں ہوں"

"ہاں! میں ہوں"

"ہاں! میں ہوں"

تیسرے اور چوتھے نے بھی نعرہ لگایا۔

اندھیرے میں پہلے کے چہرے پر خوشی کی لکیریں اُبھریں مگر پھر فوراً ہی خوشی کی یہ لکیریں تردد کے جال میں بدل گئیں "میں نے ایک دو تین بار 'میں ہوں' کی تکرار سُنی ہے۔ کہیں یہ میری اپنی آواز کی بازگشت یا اجنبی آوازوں کا سراب تو نہیں؟ — اگر نہیں تو یہاں جو موجود ہو اپنی آواز پھر دُہرائے"

"میں ہوں"

"میں ہوں"

"میں ہوں"

تینوں نے یکے بعد دیگرے پھر آواز لگائی۔

"صرف میں ہوں کہنا تو کافی نہیں۔ اپنے اپنے نام اور پہچان بھی بتاؤ تاکہ میں تمھارے ہونے کی گواہی دے سکوں۔"

"میری پہچان نے موت کا ذائقہ چکھ لیا ہے اور اب مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں میں ہوں۔" چوتھے نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ تمھارے لفظ سچے ہیں۔ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔" تیسرا بولا۔

"اپنے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔" دوسرے نے صدا دی۔

"تو تم سب بھی میری ہی طرح اپنی پہچان کھو چکے ہو اور اب بے نام زندگی گزار رہے ہو۔" پہلے نے تاسف بھرے لہجے میں کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔ لمحوں یا شاید صدیوں بعد جب خاموشی زہر کی طرح اس کے رگ ریشے میں سرایت کرنے لگی تو وہ درد سے بے چین ہو کر بولا۔ "مگر ہمارا کوئی نہ کوئی نام تو ہونا ہی چاہیے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے نام خود ہی تجویز کریں۔"

"مشکل یہ ہے کہ ہر نام کسی چیز یا رشتے کا نشان ہے جبکہ اشیاء کی شباہت اور رشتوں کی تقدیس بھی گم ہو گئی ہے۔ ایسے میں کوئی نام تجویز کرنا بالکل لاحاصل ہے۔" دوسرے نے کہا۔

"وہ تو ہے لیکن۔۔" تیسرے نے ادھورے جملے سے اپنا مقصد بیان کیا۔

"یہ تو ظاہر ہے کہ ہم اس سیہ خانے میں کسی نہ کسی جرم کی سزا کاٹ رہے ہیں اور اس اعتبار سے قیدی ہیں۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو قیدی ہی کہکر پکاریں۔" چوتھے نے تجویز پیش کی۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ یہی ہمارا نام بھی ہے اور پہچان بھی۔" سبھوں نے اس کی تائید کی۔

آواز کی روشنی ڈوبی تو سیاروں کی طرح وہ پھر ایک دوسرے سے دُور ہو گئے ۔۔۔

"نام کا مسئلہ تو حل ہوگیا۔ اب ہمیں اپنا اپنا تعارف کرانا چاہیئے اور تعارف کراتے وقت یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ہم قیدی ہیں اور یہی ہماری پہچان ہے۔ سو باری باری ہم میں سے ہر کوئی یہ بتائے کہ وہ کس جرم کی سزا میں یہاں بھیجا گیا ہے۔" قیدی نمبر ایک نے آواز کا پل طے کرکے دوسروں کے قریب آنے کی کوشش کی۔

"ہاں! یہ صحیح ہے۔" سبھوں نے لبیک کہا۔

"تو پھر سب سے پہلے میں ہی اپنا تعارف کراتا ہوں۔" پہلے قیدی نے کہا۔ دوسرے قیدیوں نے اپنے کان کھڑے کرلئے اور اندھیرے میں بلاوجہ اپنی آنکھیں پھاڑ لیں۔

"اپنا تعارف بہت مختصر ہے۔ میں پیدا ہوا تو ہر طرف خوشیوں کے شادیانے بجائے گئے۔ مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ بچپن اور لڑکپن ناز و نعم سے گزرا مگر جب جوان ہوا تو اچانک ایک دن یہ راز کھُلا کہ میری ماں اپنی نہیں سوتیلی ہے۔ سوتیلی ماں نے مجھے بڑی اذیتیں دیں اور بالآخر مار پیٹ کر یہاں پھنکوا دیا جہاں سے تم میری آواز سُن رہے ہو۔"

"تمھاری اپنی ماں کیا ہوئی؟" دوسرے قیدی نے سوال کیا۔

"میری اپنی ماں؟" قیدی نمبر ایک چونکا اور پھر ذرا توقف کے بعد افسردگی کے ساتھ بولا۔ "مجھے اپنی ماں کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ کبھی میری کوئی اپنی ماں بھی تھی۔"

"چ چ۔ چ چ۔ چ چ۔" باقی تینوں قیدیوں نے قیدی نمبر ایک کے حال پر افسوس کا اظہار کیا۔

"اب میں اپنا احوال بیان کرتا ہوں۔" قیدی نمبر دو نے کہنا شروع کیا۔ "میں جس ملک کا رہنے والا ہوں وہاں لوگوں نے سچ کو جھوٹ بنا دیا تھا اور جھوٹ کو سچ۔ جھوٹ بولنے والوں کو بڑی بڑی جاگیروں اور خطابات سے نوازا جاتا اور سچ بولنے والوں کو سُولی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔" وہ چند ثانئے کو رُکا پھر بولا۔ "تم نے بادشاہ کو ننگا کہنے والا قصّہ تو سُنا ہی ہوگا اِس لئے اب تمھیں صرف یہ بتانا ہے کہ جس شخص نے بھرے دربار میں بادشاہ کو ننگا کہا تھا وہ میں تھا۔ اور یہاں

اسی جرم میں قید ہوں۔"

"بادشاہ ننگا ہونے کے ساتھ ساتھ اندھا بھی تھا کیا؟" قیدی نمبر تین نے پوچھا۔

"یہ تو نہیں بتا سکتا لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ پورا ملک یقینی طور پر اندھا تھا۔" قیدی نمبر دو نے جواب دیا۔

"بیچ - بیچ بیچ۔" باقی قیدیوں نے قیدی نمبر دو کے ساتھ اس ملک کی حالت پر بھی اظہارِ افسوس کیا۔

"میرے شہر کا حال بھی اس ملک سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔" اب قیدی نمبر تین گویا ہوا۔"میرے شہر میں حق و باطل کی جنگ ہو رہی تھی اور لوگ رفتہ رفتہ حق کو چھوڑ کر باطل کے ساتھ ہوتے جا رہے تھے۔ کیونکہ وہاں کے مرد اپنی بزدلی کے باعث نامرد ہو گئے تھے، اور عورتیں اپنی بنجر کوکھ کے نوحے سے بے خبر کتوں اور بلیوں سے دل بہلانے لگی تھیں۔ میں نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو لوگوں کو بہت برا بھلا کہا اور حق کی سربلندی کے لئے عملی جدوجہد میں شریک ہو گیا۔ اور اس کے نتیجے میں آج اس سیہ خانے میں سڑ رہا ہوں۔"

"کیا تم سقراط کے ساتھ تھے؟" قیدی نمبر چار نے دریافت کیا۔

"نہیں۔"

"تو کیا یسوع کے ساتھ؟"

"نہیں۔"

"حسینؑ کے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تم کس کے ساتھ تھے؟"

"کسی کے بھی نہیں ــ یا شاید سبھوں کے ساتھ۔"

"بیچ - بیچ - بیچ۔" باقی قیدیوں نے قیدی نمبر تین کے علاوہ نہ جانے کس کس کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی۔

"جہاں میں تھا وہاں کا امیر اپنی تاج پوشی سے پہلے رعایا سے خوب خوب وعدے کرتا اور اُنھیں پہاڑوں سے بھی زیادہ قوت کا مالک بنا کر متحد رہنے کی تلقین کرتا تھا۔" قیدی نمبر چار نے اپنا تعارف شروع کیا۔ "لیکن رسم تاج پوشی کے بعد اپنے تمام وعدے بھلا دیتا اور رعایا میں پھوٹ ڈال کر ان میں سے ایک ایک فرد کے الگ الگ کوڑے لگواتا اور ان کی بہو بیٹیوں کی ان کی نظروں کے سامنے بے حُرمتی کرتا تھا۔ لوگ پریشان تھے مگر کچھ کر نہ سکتے تھے کیونکہ وہ بٹے ہوئے تھے اور اس کمزوری کے ساتھ امیر کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ میں نے حالات سے تنگ آکر رعایا میں تنظیم کی تحریک شروع کر دی تاکہ متحد ہو کر امیر کے ظلم کا مقابلہ کیا جا سکے۔ امیر کو اس کی خبر ہو گئی اور اس نے مجھے اس جُرم کی پاداش میں یہاں ڈلوا دیا جہاں میں اب تک پڑا ہوں۔"

"کیا رعایا میں سے اور لوگوں کو اس کا احساس نہ تھا؟" قیدی نمبر ایک نے سوال کیا

"احساس تو سبھی کو تھا لیکن کچھ کرنا ان کے بس میں نہ تھا کیونکہ وہ حرف کی قوت سے نا آشنا تھے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے دن بھر کی محنت کے بعد تھک کر چُور ہو جاتے تھے۔"

"چچ۔ چچ۔ چچ۔" باقی قیدیوں نے اظہار ملال کے بعد خاموشی اختیار کی تو پورا سیہ خانہ جیسے راکھ ہو گیا۔

"اچھا۔ اب یہ بتاؤ۔" قیدی نمبر ایک پھر گویا ہوا۔ "تمھیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ تمھیں کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں۔ کیا تمھارا کوئی ہادی تھا جو تمھیں یہ سب باتیں بتاتا تھا؟"

"ہاں۔" سبھوں نے ایک ساتھ آواز کا پرچم لہرایا۔

"وہ کون تھا، کیسا تھا اور اب کہاں ہوگا؟"

"یہ تو ہمیں نہیں معلوم۔ ہم نے صرف اُس کی آواز سُنی تھی جو نہ جانے کدھر سے آکر سیدھے ہمارے سینے میں اُتر گئی تھی۔" سب نے باری باری ایک ہی بات دُہرائی۔

"تو کیا کائی کی طرح یہاں بیٹھے رہنے سے یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اُسی کو تلاش کریں۔ وہی

شاید ہمیں اس سیاہی کے عذاب سے نجات دلائے اور آگے کسی روشن لکیر کا پتہ دے۔"

"ہاں۔ تمھارا خیال بالکل صحیح ہے۔ ہمیں اُسی کو تلاش کرنا چاہیئے۔" سب نے بیک آواز قیدی نمبر ایک کی رائے سے اتفاق کیا۔

پھر وہ دھیرے دھیرے رینگتے ہوئے سیہ خلا سے نکلنے لگے اور اس مقام پر آگئے جہاں زرد لاغر روشنی کے چھوٹے چھوٹے دھبوں نے تاریکی کے مہیب جسم پر کوڑھ کا سماں پیدا کر دیا تھا۔

قیدی نمبر چار وہاں سے اُلٹے پاؤں اُس راستے پر چلا گیا جدھر سے وہ آیا تھا۔ قیدی نمبر تین نے آگے کی طرف قدم بڑھائے اور ان دیکھے راستے پر چل پڑا۔ قیدی نمبر دو وہیں کھڑا رہا جہاں کہ وہ تھا اور جس جگہ دونوں راستے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے تھے۔

لیکن ان سب کے بعد قیدی نمبر ایک کدھر گیا اور کس بے سمت اندھی گلی میں سر پھوڑتا پھرا یہ کسی کو معلوم نہیں۔

منظر پبلی کیشنز کی آئندہ مطبوعات

صبا اکرام

کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ

جدید افسانے کے چند گوشے

○

علی حیدر ملک

کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ

افسانہ اور علامتی افسانہ

○

اے، خیام

کے افسانوں کا مجموعہ

کپل وستو کا شہزادہ

○

شہزاد منظر

کی ایک اور متنازعہ فیہ تصنیف

محمد حسن عسکری۔ ایک مطالعہ

منظر پبلی کیشنز کی مطبوعات

جدید اردو افسانہ

تنقیدی مقالات ——— شہزاد منظر

o

اندھیری رات کا تنہا مسافر

ناول ——— شہزاد منظر

o

رَدِّ عمل

تنقیدی مقالات ——— شہزاد منظر

نام :- علی حیدر ملک

تاریخ پیدائش :- ۷ر اگست ۱۹۴۴ء

آبائی وطن :- موضع ملاٹھی، ضلع گیا (بھارت)

تعلیم :- بی۔اے (آنرز) ایم۔اے

پیشہ :- درس و تدریس (اُستاد، شعبۂ اردو، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج، بابائے اردو روڈ، کراچی ۱)

پہلی تالیف :- دبستانِ مشرق (۱۹۷۰ء)

دیگر :-

سابق نائب مدیر، سہ ماہی "عزمِ نو"

سابق نائب مدیر، ہفت روزہ "قوم"

سابق معاون مدیر، ماہنامہ "قومی زبان"

ادبی کالم نویس، انٹرویو نگار اور تبصرہ نگار، روزنامہ "جسارت"

مطبوعہ مہران پریس کراچی ۱۹۸۶ء فون نمبر ۲۱۵۶۸۵